سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

آپ لکڑی کو توڑیں تو وہ دو ٹکڑے ہو جائے گی
مگر زندہ چیزوں کے لئے شکست کا کوئی
سوال نہیں۔ ایک زندہ ایبا (AMOEBA) جب
ٹوٹتا ہے تو وہ دو زندہ ایبا بن جاتا ہے۔

شمارہ ۱۷
اپریل ۱۹۷۸

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

اداریہ ——

ایک مشہور مسلم جماعت کے ترجمان نے ماہنامہ الرسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ نقطۂ نظر ایک عظیم فتنہ کا سرچشمہ ہے۔ ایسا فتنہ جس میں علامہ مشرقی کا دماغ، پرویز کا قلم، نیاز فتح پوری کی عقل اور علامہ مودودی کی زبان اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے" (الجمعیۃ ۶ مارچ ۱۹۷۸) دوسری طرف الرسالہ کے ایک مداح لکھتے ہیں: "فکر مودودی کے مقابلہ میں فکر وحید زیادہ عمیق اور سائنٹفک ہے"۔ ان دونوں کے درمیان وہ لوگ ہیں جو اکثر ہم سے پوچھتے ہیں "کیا آپ کا الرسالہ ابھی نکل رہا ہے"۔ حالاں کہ یہ سوال اتنا ہی بے معنی سوال ہے جیسے کسی سے پوچھا جائے "کیا آپ کے صاحبزادے ابھی باحیات ہیں"۔

ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں لوگوں کو نہیں معلوم کہ تنقید دراصل اپنے بھائی کے ساتھ خیر خواہی کا نام ہے یا کم از کم علمی تجزیہ کا۔ اسی طرح لوگوں کو نہیں معلوم کہ ایک دعوت اگر انھیں حق نظر آئے تو اس کے سلسلے میں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ لوگ اپنے بیٹے کے حق میں اپنی خیر خواہی کو خوب جانتے ہیں۔ اپنے ذاتی مصالح کے سلسلے میں وہ اپنی ذمہ داریوں سے اتنا زیادہ باخبر ہیں کہ وہ ان کے لاشعور کا جزو بن گیا ہے۔ مگر دوسروں کے لئے وہ صرف لفظی تنقید یا لفظی تعریف کو کافی سمجھتے ہیں۔

ایسی حالت میں الرسالہ کے اوپر ٹائٹل کا اضافہ صرف اس کے خسارہ میں اضافہ کے ہم معنی ہے۔ تاہم یہ جانتے ہوئے صرف اس بھروسہ پر ہم یہ اقدام کر رہے ہیں کہ جو خدا "ٹائٹل کے بغیر" الرسالہ کو چلاتا رہا ہے وہ "ٹائٹل کے ساتھ" بھی الرسالہ کو چلائے گا۔

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز

فہرست

اس قسم کی باتوں سے صحیح ذہن نہیں پیدا ہو سکتا

عن زید بن ارقم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال لا الٰہ الا اللہ مخلصا دخل الجنۃ قیل وما اخلاصھا قال ان تحجزہ عن محارم اللہ (رواہ الطبرانی فی الاوسط والکبیر)

زید بن ارقم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لا الٰہ الا اللہ اخلاص کے ساتھ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پوچھا گیا کلمہ کا اخلاص کیا ہے۔ فرمایا، وہ اس کو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے روک دے۔

اس حدیث کی تشریح میں ایک بزرگ لکھتے ہیں:

"اور یہ ظاہر ہے کہ جب حرام کاموں سے رک جائے گا اور لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوگا تو اس کے سیدھا جنت میں جانے میں کیا تردد ہے۔ لیکن اگر حرام کاموں سے نہ بھی رکے تب بھی اس کلمہ پاک کی یہ برکت تو بلا تردد ہے کہ اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتنے کے بعد کسی نہ کسی وقت جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ البتہ اگر خدانخواستہ بداعمالیوں کی بدولت اسلام وایمان ہی سے محروم ہو جائے تو دوسری بات ہے۔" (۷۱)

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں یہ نقل کیا گیا کہ خوش خبری سنو اور دوسروں کو بھی بشارت سنا دو کہ جو شخص سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اخلاص کے ساتھ تھوڑا سا عمل بھی بہت کچھ رنگ لاتا ہے، اس لئے اخلاص سے جو شخص کلمۂ شہادت پڑھے اس کی ضرور مغفرت ہوگی، وہ ضرور جنت میں داخل ہو کر رہے گا۔ اس میں ذرا بھی تردد نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے کچھ دنوں سزا بھگت کر داخل ہو لیکن ضروری نہیں۔" (۸۹)

اس عبارت پر خالص "مسئلہ" کی حیثیت سے اعتراض کرنا مشکل ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ محرمات سے رکنا اور محرمات سے نہ رکنا دونوں میں اگر "بلا تردد" جنت کی خوش خبری دی جانے لگے تو اس سے کبھی صحیح ذہن نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہود بھی تو یہی کہتے تھے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً (ہم کو آگ نہیں چھوئے گی مگر چند دن) پھر اسی قسم کا عقیدہ اگر ہم بھی بنالیں تو ہمارے یہاں اس سے مختلف ذہن کیوں پیدا ہوگا جو یہود کے یہاں پیدا ہوا۔ اس قسم کے مسائل وضع کرنے والے شاید کتاب الٰہی کی اس آیت کو بھول گئے ہیں۔

لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ

نہ تمہاری خوش گمانیوں سے کچھ ہوگا نہ اہل کتاب کی خوش گمانیوں سے، جو برا کرے گا وہ ضرور اس کا بدلہ پائے گا۔

یہاں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے براہ کرم اپنا سالانہ زرتعاون روانہ فرما کر شکریہ کا موقع دیں ——— مینجر

کتابوں کی عالمی نمائش

WORLD BOOK FAIR
NEW DELHI
HALL OF NATIONS
PRAGATI MAIDAN

11-20 FEBRUARY 1978
DAILY 1-30 TO 8 P.M.
SUNDAYS 10-30 A.M. TO 8 P.M.

Inauguration by:
SHRI B. D. JATTI, Vice-President of India on 11.2.1978 at 11-15 a.m.

Presided over by:
DR. P. C. CHUNDER, Union Minister of Education & Social Welfare.

ORGANISED BY NATIONAL BOOK TRUST INDIA

کتابوں کی بین اقوامی نمائش ہندوستان میں پہلی بار ۱۹۷۲ء میں نئی دہلی میں ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۷۶ء میں۔ اور اب اس قسم کی تیسری نمائش ہمیشہ سے زیادہ بڑے پیمانہ پر جون ۱۹۷۸ء میں نئی دہلی میں ہوئی ہے۔ نئی دہلی اب بین اقوامی کتابی نمائش کے شہروں کے کلب کا ممبر ہو چکا ہے۔ ان شہروں میں فرینک فرٹ، لیپزگ، دارسا، بلگریڈ، قاہرہ، مانٹریل، سنگاپور، ٹوکیو، ماسکو وغیرہ شامل ہیں۔

نئی دہلی کی تیسری بین اقوامی کتابی نمائش میں ملکی اور غیر ملکی شرکا کی تعداد توقع سے زیادہ ہوگئی۔ چنانچہ پرگتی میدان میں ۱۴۰۰۰ مربع میٹر جگہ اس کے لئے مخصوص کرنی پڑی جو پچھلی دونوں نمائشوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ امریکہ، انگلستان، روس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، ہالینڈ، زیکوسلاویکیہ، بلگریڈ، ہنگری، رومانیا، سوئزرلینڈ، یوگوسلاویا، کینیا، زمبیا، گھانا، سینیگال، عراق، مصر، کویت، بنگلہ دیش، پاکستان، سنگاپور، جاپان، انڈونیشیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ۳۵ غیر ملکوں کے ۲۰۰ ناشرین نے اس موقع پر شرکت کی اور اس نمائش میں اپنا اسٹال لگایا۔ ہندوستان کے جن ناشرین نے اس میں شرکت کی ان کی تعداد تقریباً ۴۰۰ ہے۔ ان کے علاوہ اقوام متحدہ اور متعدد دوسرے ملکوں نے اپنے اطلاعاتی دفاتر اس موقع پر قائم کئے۔

پرائیویٹ اداروں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مرکزی اور ریاستی اداروں نے نمائش میں اپنے اپنے اسٹال کھولے۔ تاہم تین بڑی عمارتوں اور ان کے درمیانی پارک میں پھیلی ہوئی اس وسیع نمائش میں سب سے زیادہ غلبہ انگریزی کتابوں کا رہا۔ دوسرے نمبر پر ہندی کتابیں تھیں۔ اور اس کے بعد اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کی کتابیں نیز غیر ملکی زبانوں کی کتابیں مثلاً روسی، جرمن، جاپانی، عربی، فارسی وغیرہ۔

اس موقع پر کتابوں کی نمائش کے علاوہ دوسری معاون تقریبات کا پروگرام بھی رکھا گیا۔ مثلاً کتابوں کی اشاعت کے مختلف پہلوؤں پر سیمینار، ایک چار روزہ بین اقوامی سیمینار بھی ہوا جس میں دنیا کے مختلف حصوں کے ماہرین نے تعلیمی مطبوعات کے بارے میں بحث و مباحثہ کیا۔ اسی طرح نمائش کے دوران متعدد دوسرے پروگرام ہوتے رہے۔ مثلاً فیڈریشن آف انڈین پبلشرس کی طرف سے ریفریشر کورس، فیڈریشن آف پبلشرس اینڈ بک سیلرس اسوسی ایشن کی طرف سے بین اقوامی کتابی صنعت پر لکچر اور ٹریننگ کورس۔ آتھرس گلڈ آف انڈیا کی طرف سے

نئی دہلی کی تیسری ورلڈ بک فیر (فروری ۱۹،۸۰) کا ایک منظر۔ کتابوں کی قطار میں "کتاب سبز" دکھائی دے رہی ہے ——

مصنفین کا کنونشن وغیرہ ۔

یونیسکو کے تازہ اعداد وشمار کے مطابق ہندستان، کتابوں کی پیداوار کے معاملہ میں دنیا کا ساتواں سب سے بڑا ملک ہے ۔ انگریزی کتابوں کی تیاری میں امریکہ اور انگلستان کے بعد ساری دنیا میں اس کا تیسرا نمبر ہے ۔ ملکی اعتبار سے چند زبانوں کے اعداد وشمار یہ ہیں :

۱۹۷۶ میں	انگریزی کتابیں	۶۷۳۳
	ہندی	۲۲۳۵
	کنٹری	۱۲۶۱
	مراٹھی	۱۲۹۰
	بنگالی	۱۱۴۶
	گجراتی	۷۶۰
	ٹامل	۶۹۷
	ملیالم	۴۵۰
	اردو	۲۶۹

یہ اعداد وشمار سرکاری ہیں ۔ تاہم اصل تعداد اغلباً اس سے زیادہ ہوگی ۔ اندازہ ہے کہ ہندوستان میں ہر سال ۲۰ ہزار سے زیادہ کتابیں مختلف زبانوں میں چھپتی ہیں ۔ ہندستان دنیا کی آبادی کا پندرہ فی صد ہے ، مگر ہندستان کی مطبوعات دنیا بھر میں چھپنے والی کتابوں کا بمشکل چار فی صد ہوتی ہیں ۔ موضوع کے اعتبار سے ہندستانی مطبوعات کی تقسیم یہ ہے :

ادبی کتابیں	کل مطبوعات کا	۳۱ فی صد
سیاسی اور معاشی کتابیں		۱۳ فی صد
طب اور طبیعیاتی سائنس		۳ فی صد

وہ کتابیں جن کی اشاعت (PRINT-RUN) زیادہ ہے وہ یا تو کورس کی کتابیں ہیں یا ناول ۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ایک ملین آبادی پر ہر سال تقریباً ۵۰۰ کتابوں کا اوسط ہے جب کہ ہندستان میں یہ اوسط صرف ۳۰ ہے ۔ دوسرے ملکوں میں فی شخص سالانہ ۲۰۰۰ صفحات کا اوسط ہے اور ہندوستان میں صرف ۳۲ صفحات کا ۔

ہندستان کی مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے اشتراک سے ایک اسکیم چلائی جا رہی ہے جس کا مقصد ملک کی علاقائی زبانوں میں یونیورسٹی سطح کی کتابیں شائع کرنا ہے ۔ اس سلسلے میں اب تک تقریباً ساڑھے چار ہزار کتابیں شائع کی جا چکی ہیں ۔ ان کتابوں کی قیمتیں "نہ نفع نہ نقصان" کے اصول پر رکھی جاتی ہیں ۔

ایک ہندستانی ڈائرکٹری میں گیارہ ہزار ملکی ناشرین کے نام وپتے چھاپے گئے ہیں ۔ ان میں ڈھائی ہزار ہندی ناشرین ہیں ۔ سترہ ہزار انگریزی ، اور چودہ ہزار بنگالی ۔ انگریزی زبان اب بھی ہندستان میں غالب حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی ملک کے خوش حال طبقہ کی زبان ہے ۔ اس لئے انگریزی زبان میں چھپنے والی کتابیں بہت جلد بازار میں اپنا مقام پا لیتی ہیں ۔ دوسری زبانوں کی مطبوعات زیادہ تر ادب ، مذہب اور ثقافت سے متعلق ہوتی ہیں ۔

ہندستان میں تصنیف کے کام کو ترقی دینے کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے ہیں ۔ ان میں انڈین کاپی رائٹ ایکٹ میں کی گئی حالیہ ترمیم اور مصنفین کے لئے نقد انعامات شامل ہیں ۔

●●●●●●●●●●●●●●●●●●

کبھی جاننا اس کا نام ہوتا ہے کہ آدمی یہ کہہ دے کہ "میں نہیں جانتا "

ہیوی ویٹ باکسنگ کے سابق چیمپین محمد علی (۳۶) کو لیون اسپنکس (۲۴) نے ۱۵ فروری ۱۹۷۸ کو ہرا دیا۔ محمد علی کے لئے یہ بے حد غیر متوقع تھا۔ کیونکہ پچھلے ۱۴ سال کی مسلسل کامیابیوں نے محمد علی کے اندر اتنا زیادہ اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ وہ کہنے لگے تھے:

I AM KING OF THE WORLD

میں دنیا کا بادشاہ ہوں۔

تاہم یہ امکان ہے کہ یہ شکست محمد علی کی زندگی کے لئے ایک نیا موڑ پیدا کرنے کا باعث ہو۔ تین سال پہلے محمد علی نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کھیل کی دنیا سے ریٹائر ہو جائیں گے تاکہ "اسلام کی خدمت کریں اور اپنی قوم کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے کام کریں"۔

جون ۱۹۷۵ میں محمد علی کی ملاقات حاجی بی کے حسن (کالی کٹ) سے ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کوالالمپور میں تھے۔ حاجی حسن کی باتوں سے محمد علی بے حد متاثر ہوئے۔

Heavyweight boxing champion Muhammad Ali (centre) prayer at Kuala Lumpur's National Mo sque on Friday last. On right is Ali's brother Rahman and on left Fuad Stephen, Governor of Sabah. (Times of India June 24, 1975)

"حاجی حسن نے مجھ کو اسلام کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کیا"، محمد علی نے کہا "اس نے حیرت انگیز طور پر میرے نقطۂ نظر کو بدل دیا۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ مذہب کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت صرف کروں"۔

مگر اس کے بعد محمد علی اپنے ارادہ پر قائم نہ رہ سکے۔ انھوں نے کھیل کے میدان میں اپنی مشغولیت کو بدستور جاری رکھا۔ تاہم موجودہ شکست نے دوبارہ ان کے ذہن کو ماضی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ۱۷ فروری کو لندن میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں دوبارہ اسپنکس سے لڑوں گا اور چیمپین کا ٹائٹل اس سے چھینوں گا"۔ تاہم اگر میں ایسا نہ کر سکا تو میں سمجھوں گا کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنی زندگی کا رخ مذہب کی طرف موڑ دوں"۔

THEN I WOULD GIVE MY LIFE TO THE LOVE OF GOD AND THE HOLY KORAN AND BECOME A FULL-TIME DEDICATED MUSLIM EVANGELIST. 'WHAT I REALLY WANT TO DO IS CONVERT PEOPLE,' ALI WENT ON. 'IN 50 YEARS, EVERYONE WHO READS THIS INTERVIEW WILL BE DEAD AND GOING TO HEAVEN OR HELL. I WANT THEM TO GO TO HEAVEN.'

The Times of India, 18.2.1978

پھر میں اپنی زندگی کو خدا کی محبت اور مقدس قرآن کے لئے وقف کر دوں گا۔ میں ہمہ وقتی طور پر مسلم مبلغ بن جاؤں گا۔ در حقیقت میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں لوگوں کو مسلمان بناؤں۔ آج جو لوگ میرے اس انٹرویو کو پڑھ رہے ہیں، ان میں سے ہر ایک پچاس برس بعد مر چکا ہو گا اور اس کے بعد یا تو جنت میں اس کا ٹھکانا ہو گا یا جہنم میں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو جنت میں پہنچانے کی کوشش کروں

(ٹائمس آف انڈیا ۱۸ فروری ۱۹۷۸)

"جو لوگ ان سطروں کو پڑھ رہے ہیں، ان میں سے ہر شخص پچاس برس بعد مرچکا ہوگا۔ اس کے بعد اس کا ٹھکانا یا تو جنت ہے یا جہنم۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو جنت میں پہنچانے کی کوشش کروں" ــــــــ کیسی عجیب ہے یہ بات۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہے کہ یہ بات ایک کھلاڑی کی زبان سے آج کی دنیا کو سننے کو ملی ہے۔

مسلمان کی حیثیت سے ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم دنیا کو آنے والے دن کی چیتاونی دیں۔ ہر دن لاکھوں انسان زمین پر مر رہے ہیں۔ مگر ان کو نہیں معلوم کہ وہ مر کر کہاں جا رہے ہیں۔ پیغمبر کے ذریعہ اللہ نے اس راز کو کھولا ہے اور پیغمبر کے بعد ہمارے اوپر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ ہم اس سب سے بڑی حقیقت سے اہل عالم کو باخبر کریں۔ تاکہ لوگ زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہونے سے پہلے اس کے مسائل سے واقف ہو جائیں اور ابھی سے اس کی تیاری شروع کر دیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں بے شمار مسلم تحریکیں ساری دنیا میں کام کر رہی ہیں۔ مگر کوئی ایسی تحریک نہیں جو فی الواقع اس لئے اٹھی ہو کہ دنیا والوں کو اس آنے والے ہولناک دن سے آگاہ کرے۔

یاد رکھئے اللہ کی نظر میں ہماری قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ ہم اس کا مطلوبہ کام کر رہے ہوں۔ اگر ہم اس کام کو انجام نہ دیں تو اللہ کی نظر میں ہماری کوئی قیمت نہیں۔ خدا کو نہ ہماری کرامانوں کی ضرورت ہے اور نہ ہمارے انقلابی نعروں کی۔ اس کو نہ شان دار عمارتیں درکار ہیں اور نہ جگمگاتے ہوئے پنڈال۔ اس کو تو صرف یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندے اس سے باخبر ہو جائیں کہ ان کا رب بالآخر ان سے کیا معاملہ کرنے والا ہے۔

آدمی دن کی روشنی میں یہ سمجھ کر اپنا نظام بناتا ہے کہ تھوڑی دیر میں شام آنے والی ہے اور رات کو اس یقین کے ساتھ سوتا ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد ضرور صبح ہوگی۔ مگر آخرت کی دنیا کا کسی کو ہوش نہیں۔ کوئی نہیں جو موت کو اس طرح دیکھ رہا ہو جس طرح دن کا ایک مسافر آنے والی شام کو دیکھتا ہے۔ اور ایسے لوگ تو معدوم کے درجے میں ہیں جو موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ ہر آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے جیسے موت بھی دوسروں کے لئے ہے اور جہنم بھی دوسروں کے لئے

سب سے پہلا کام جذباتیت کو ختم کرنا اور لوگوں کو باشعور بنانا ہے

ایک بادشاہ اور اس کے وزیر میں بحث ہوئی۔ سوال یہ تھا کہ طبیعت غالب آتی ہے یا تربیت۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ تربیت کے ذریعہ کسی کے اندر نئے اوصاف پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ جب کہ وزیر کا کہنا یہ تھا کہ تربیت سے کسی کو بدلا نہیں جاسکتا۔ کسی کی جو اصل طبیعت ہے، وہ بالآخر غالب آکر رہتی ہے۔

بادشاہ نے طے کیا کہ وہ وزیر کو غلط ثابت کرے۔ اس نے محل کے خادموں کو حکم دیا کہ دو بلیاں حاصل کریں اور ان کو اس بات کی تربیت دیں کہ وہ اپنے دونوں اگلے پیروں میں مشعل لے کر کھڑی رہیں۔ تربیت شروع ہوگئی۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ کی مشق کے بعد دو بلیاں ایسی تیار کرلی گئیں جو مشعل لے کر کھڑی ہوسکتی تھیں۔

بادشاہ کو جب بلیوں کے تربیت یافتہ ہونے کا پورا اطمینان ہوگیا تو اس نے ایک تاریخ مقرر کرکے اعلان کردیا کہ اس روز خصوصی دربار ہوگا۔ وزیر کو بھی اس میں شریک ہونے کا حکم دے دیا گیا۔ مقررہ تاریخ پر سارے لوگ جمع ہوئے۔ دربار سجایا گیا۔ اس کے بعد دونوں تربیت یافتہ بلیاں لائی گئیں۔ ان کو بادشاہ کے تخت کے دونوں طرف اس طرح رکھا گیا کہ دونوں بالکل ساکت و صامت دو مشعلوں کو لئے ہوئے دونوں طرف کھڑی ہوئی تھیں۔

اب بادشاہ وزیر کی طرف مخاطب ہوا۔ "دیکھو، یہ بلیاں کیا بتا رہی ہیں۔ طبیعت غالب آتی ہے یا تربیت"۔ وزیر کو بادشاہ کی ان تیاریوں کا حال پہلے سے معلوم تھا۔

چنانچہ دربار کے لئے آتے ہوئے اس نے ایک چوہا اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ بادشاہ اپنے فخریہ چیلنج کو پیش کرچکا تو وزیر بولا "حضور جان بخشی ہو تو میں اس کا جواب دوں"۔ بادشاہ نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا، ہاں اپنا جواب پیش کرو۔ تم کو پوری اجازت ہے"۔ اس کے بعد وزیر بلیوں کے قریب آیا اور جیب سے چوہا نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ چوہا سامنے آتے ہی جو واقعہ ہوا وہ یہ کہ دونوں بلیاں مشعل کو پھینک کر چوہے کے اوپر جھپٹ پڑیں۔ بادشاہ کے چیلنج کا یہ اتنا مؤثر جواب تھا کہ اس کے بعد وزیر کو یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ "حضور دیکھ لیجئے، تربیت کے اوپر طبیعت غالب آگئی"۔

یہ تمثیل، کم از کم جزوی طور پر، ان ملکوں پر صادق آتی ہے جہاں اسلامی جماعتیں عوامی ووٹ کی طاقت سے اسلام کو غالب کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ جماعتیں عوام کو اسلام کے نام پر اکٹھا کرتی ہیں اور اس کے بعد ایک شاطر سیاست داں ایک "شوشہ" چھوڑ دیتا ہے اور معاً سارے اسلامی ووٹر اسلامی کیمپ کو چھوڑ کر ان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ بلی کی تربیت کی ساری کوشش "چوہے" کو دیکھتے ہی ختم ہوجاتی ہے

یہ اسلامی جماعتیں اسلامی حکومت قائم کرنے کے نام پر میدان سیاست میں کودتی ہیں۔ برسوں تک پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعہ ملک کی رائے عامہ کو اسلام کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ "غلاف کعبہ" اور "شوکت اسلام" کے نام پر ہونے والے جلوسوں میں لوگ جوق در جوق شرکت کرتے ہیں۔ "اسلام زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ اسلام کی یہ دھوم دیکھ کر اسلامی قائدین کو گمان ہونے لگتا ہے کہ ۹۹ فی صد لوگ

ان کے ساتھ ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی اسلامی قائد کو یہ پُر فخر الفاظ کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ "اب ہمارا نقطۂ نظر بہتر طور پر سمجھا جانے لگا ہے۔ ملک میں ہماری اکثریت ہے۔ ہر فرد اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ اسلامی نظام قائم کیا جائے (ذکری، دسمبر ۱۹۷۷) ۔

اس "صدفی صد" اکثریت کے باوجود جب الکشن ہوتا ہے تو یہ اسلامی جماعتیں بری طرح ہار جاتی ہیں، حتیٰ کہ ان کے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب ملک کے "صدفی صد" لوگ اسلامی جماعتوں کے حلقۂ متفقین میں شامل ہیں تو وہ لوگ کہاں سے آتے ہیں جو "دھاندلی" کر کے ان کو شکست فاش دے دیتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ وہی عوام ہیں جن کے "ہر فرد" کو اپنا حامی سمجھ لیا گیا ہے۔ مسلم ملکوں، خاص طور پر برصغیر ہند کے مسلمان، اتنے زیادہ جذباتی ہیں کہ کسی بھی تماشے کی بات کے پیچھے نہایت آسانی سے دوڑ پڑتے ہیں۔ فروری ۱۹۷۸ میں محمد علی کے مقابلہ میں لیون اسپنکس کی جیت عیسائی حلقوں کے لئے زبردست خوشی کا باعث تھی۔ مگر یہ ناقابل تصور ہے کہ اس کے بعد اسپنکس کو امریکہ کی طرف سے کسی ملک کا سفیر بنا دیا جائے۔ جب کہ محمد علی کو شکست کے باوجود، بنگلہ دیش کی حکومت کی غیر معمولی مہمانی کا شرف حاصل ہوا اور ۲۴ فروری کو ڈھاکہ میں اعلان کیا گیا کہ محمد علی، امریکہ میں حکومت بنگلہ دیش کے اعزازی نمائندہ (کونسل جنرل) ہوں گے اور ان کی کار اور ان کے مکان پر بنگلہ دیش کا سرکاری جھنڈا لہرائے گا۔ امریکہ میں کھیل کا ایک ہیرو میدان سیاست کا ہیرو نہیں بنایا جا سکتا۔ جب کہ برصغیر ہند میں ایک فلم ایکٹر وزیر اعلیٰ بن سکتا ہے اور ایک مکا باز سرکاری سفیر۔

مسلم ملکوں کے عوام کی یہی جذباتیت اور بے شعوری ہے جس نے ان کو نعرہ باز سیاست کے لئے زرخیز زمین بنا دیا ہے۔ اسلام کے نعرہ میں روایتی اور جذباتی کشش انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مگر اس کشش کی کوئی زیادہ گہری بنیاد نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شاطر سیاستداں میدان میں آتا ہے اور کوئی ایسا پُر فریب شوشہ چھوڑتا ہے جس میں وقتی دل چسپی کا سامان ہو تو وہ نہایت آسانی سے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اس وقت ان ملکوں کے عوام کا ٹھیک وہی حال ہوتا ہے جو تربیت یافتہ بلیوں کے سامنے چوہا چھوڑنے کا ہوا تھا۔ اس طرح اسلامی سیاست کا نتیجہ عملاً اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا کہ ایک "مسٹر شاطر" کی جگہ دوسرے مسٹر شاطر اقتدار کی کرسی پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ "مولانا اسلام"، کی محرومی "انقلاب"، کے بعد بھی اسی طرح باقی رہتی ہے جیسے وہ انقلاب سے پہلے تھی۔

ہندستان میں لوک سبھا کی میعاد میں دوبار ایک ایک سال کی توسیع کے بعد ۱۸ جنوری ۱۹۷۷ کو جب وزیر اعظم اندرا گاندھی نے چھٹے عام الکشن (اپریل ۱۹۷۷) کا اعلان کیا تو پاکستان میں مسٹر بھٹو کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے ووٹروں سے یہ کہہ سکیں کہ ہندستان نے ان کے زیر اثر لوک سبھا کا الکشن کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ یہ حسن اتفاق مسٹر بھٹو کا ساتھ دے رہا تھا کہ انھوں نے ہندستان سے کسی قدر پہلے اپنے ملک میں دوسرے عام الکشن (مارچ ۱۹۷۷) کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا۔

پونیہ پریہ داس گپتا نے ان دنوں پاکستان کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"مسٹر بھٹو کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شاہ ضرب سے

فی الواقع برصغیر ہند کی قیادت چھین لی ہے۔ ان کا پُراسرار استدلال یہ ہے کہ پاکستان میں الکشن کے انعقاد کا اعلان کر کے انھوں نے مسز اندرا گاندھی کو مجبور کر دیا کہ وہ بھی ان کی پیروی کریں اس کے بعد ان کے لئے یہ مشکل نہ ہوگا کہ دوسرے معاملات میں بھی وہ ہندستان کو آمادہ کر سکیں کہ وہ پاکستان کا لحاظ کرے۔"

(انڈین اکسپرس ۱۱ فروری ۱۹۷۷)

اسی قسم کے شوشے تھے جنھوں نے پاکستان کے پچھلے دو الکشنوں میں مسٹر بھٹو کو کامیاب کیا، اور اگر پاکستان میں دوبارہ الکشن ہوں تو اسی طرح کوئی "مسٹر بھٹو" دوبارہ شوشے چھوڑ کر یقینی طور پر ووٹروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اور "مولانا اسلام" حیرت کے ساتھ دیکھیں گے کہ ان کا بیلٹ بکس خالی پڑا ہوا ہے۔

غلطی پر غلطی یہ ہے کہ یہ اسلامی جماعتیں مسئلہ کو گہرائی سے نہ دیکھ کر فوراً یہ کہہ دیتی ہیں کہ ہماری شکست اس لئے ہوئی کہ "فریق ثانی نے دھاندلی کی تھی"۔ یہ بات خالص منطقی طور پر صحیح ہونے کے باوجود الکشنی سیاست کے سلسلے میں بالکل بے معنی ہے۔ دھاندلی اگر شکست و فتح کے لئے اتنی ہی مؤثر ہے تو سوال یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے مقابلہ (دسمبر ۱۹۷۰) میں یحییٰ حکومت ساری دھاندلیوں کے باوجود کیوں ہار گئی۔ اور اندرا گاندھی کی بے مثال دھاندلیوں کے باوجود جنتا پارٹی کو کیوں کامیابی (اپریل ۱۹۷۷) حاصل ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ "دھاندلی" کا لفظ بول کر اپنی شکست کی توجیہہ کرتے ہیں، وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ دو میں سے کسی ایک دیوالیہ پن کی سرحد تک پہنچ گئے ہیں۔ سیاسی تدبر کا دیوالیہ پن یا اخلاص کا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی جماعتوں کی یہ باتیں اس قدر خالی از معنی ہیں کہ اگر منطقی اعتراض سے بچنے کے لئے ان کو "سیاسی جھوٹ"، نہ کہا جائے تو اس انتہائی لاحاصل سیاسی مشغلہ کے بارے میں کم از کم یہ تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان پر انگریزی کی یہ کہاوت پوری طرح صادق آتی ہے:

FOOLS RUSH IN WHERE
ANGELS FEAR TO TREAD

نادان لوگ وہاں جا گھستے ہیں جہاں فرشتے قدم رکھنے سے گھبراتے ہیں۔

ایسی سیاست جو ذرائع و وسائل کی بربادی کے ہم معنی ہو۔ جو اہل ملک کی منفی جذباتیت میں اضافہ کرے، جو بار بار ایسے ناکام ہنگامے کھڑے کرے جن سے قدیم روایتیں ٹوٹ جائیں اور نئی صالح روایتیں قائم نہ ہوں، جو بے شمار اقتصادی اور سماجی نقصانات کے بعد عملاً صرف یہ نتیجہ دکھائے کہ ایک ظالم حکمراں کی جگہ دوسرا اس سے ظالم تر حکمراں تخت اقتدار پر قبضہ کر لے، حتیٰ کہ جو اپنے "اسلامی محاذ"، کو مضبوط بنانے کے لئے تخریبی عناصر کو اس طرح ابھارے کہ وہ زندہ ہو کر خود مسلم ملک کے ٹکڑے کر ڈالیں۔ ایسی سیاست کو کم سے کم جو نام دیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے۔

اعلان

الرسالہ ماہ جنوری ۱۹۷۷ کے شمارے قیمتہً درکار ہیں۔ جو لوگ فراہم کر سکیں، مطلع فرمائیں۔ منیجر

علم کلام کی حقیقت

ابو الہذیل العلاف نویں صدی عیسوی کا ایک متکلم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر تین ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ ابو الہذیل کا کہنا تھا کہ صفت کسی طرح ذات کی محمول نہیں ہو سکتی، صفت یا تو عین ذات ہے یا غیر ذات۔ وہ آخرت میں کسی مادی زندگی کا قائل نہ تھا۔ کیونکہ مادی یا جسمانی زندگی کے لئے حرکت ضروری ہے اور "حرکت کی ایک ابتدا ہے اور ہر ابتدا اپنی انتہا پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے" ——— مذہب کی تعلیمات کو قدیم فلسفہ کی اصطلاحوں میں سمجھنے کی اِن کوششوں نے ہمارے متکلمین کو عجیب و غریب قسم کی بے فائدہ موشگافیوں میں الجھا دیا۔ علم کلام، فلسفہ و منطق کے بجائے اگر قرآنی برہانیات (بالفاظ دیگر حقائق کون) کی بنیاد پر وضع کیا جاتا تو علم کلام اس الہیاتی استدلال کا علم ہوتا جس کو قرآن میں "حجت ابراہیم" کہا گیا ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی کو کوئی ایسی چیز دی جاتی تھی جس سے وہ اپنی مخاطب قوم پر اپنی صداقت کو مدلل کر سکے۔ مختلف انبیاء کو اس سلسلے میں مختلف چیزیں دی گئیں جو ان کے اپنے حالات کے لحاظ سے انھیں درکار تھیں :

تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض، منھم من کلم اللہ و رفع بعضھم درجات و آتینا عیسی بن مریم البینات وایدناہ بروح القدس (بقرہ — ۲۵۳)

یہ پیغمبر کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فوقیت بخشی ہے۔ کوئی ان میں ہے کہ اللہ نے اس سے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسی بن مریم کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی۔

حضرت ابراہیم کو اس مقصد کے لیے جو چیز دی گئی وہ حجتِ عقلی تھی۔ اگرچہ یہ استعداد ہر نبی کے اندر موجود تھی مگر آپ کو خصوصی طور پر اس کا فیضان ہوا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص طور پر آپ کی طرف منسوب فرمایا۔ ارشاد ہوا ہے :

وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیم علیٰ قومہ (انعام - ۸۴)

اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی۔

قرآن میں حجتِ ابراہیم کے دو واقعات بصراحت مذکور ہیں۔ ایک، قوم کی ستارہ پرستی پر آپ کا اعتراض۔ دوسری، بادشاہِ وقت (نمرود) سے آپ کی گفتگو۔ میں یہاں دوسری حجت کو نقل کرتا ہوں:

الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ان آتاہ اللہ الملک۔ اذ قال ابراھیم ربی الذی یحیی ویمیت قال انا اُحی وامیت قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر (بقرہ - ۲۵۸)

کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے بحث کی اپنے رب کے بارے میں، اس واسطے کہ اللہ نے اس کو سلطنت دی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بولا کہ میں جلاتا ہوں اور مارتا ہوں۔ پھر ابراہیم نے کہا اللہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے تو اس کو مغرب سے لادے، اس پر وہ منکر بھوچکا ہو گیا۔

اس مثال میں مخاطب نے پیغمبر سے حجت کی ہے یعنی وہ اس دعوے کے لیے دلیل کا مطالبہ کرتا ہے جو دونوں کے درمیان زیرِ بحث ہے۔ سوال یہ تھا کہ کسی کو قابلِ بندگی ہونے کا حق کس بنیاد پر ملتا ہے۔ مخاطب کا دعوی تھا کہ یہ معیار مقتدرِ اعلیٰ ہونا ہے اور چونکہ وہ ملک کا مقتدرِ اعلیٰ ہے، اس لیے وہ بندگی کا مستحق ہے۔ حضرت ابراہیم نے عقلی استدلال کے ذریعے ثابت کیا کہ زمین و آسمان کے حقیقی اقتدار کا مالک بادشاہ نہیں خدا ہے۔ آپ کا استدلال اتنا قوی تھا کہ مخاطب مبہوت ہو کر رہ گیا۔

اس مثال سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ جب مخاطب عقلی دلیل مانگے تو دعوت کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے سامنے عقلی دلیل پیش کی جائے۔

۲۔ یہ عقلی استدلال اس معیارِ استدلال کے مطابق ہونا چاہیے جو خود مخاطب نے

پیش کیا ہو۔

۳۔ استدلال اتنا قوی ہو کہ مخاطب اپنے کو دلیل سے عاجز سمجھنے لگے جس کا نفسیاتی نام مبہوت ہونا ہے۔

یہی علم کلام ہے۔ علم کلام کا مقصد، بنیادی طور پر یہ ہے کہ مخاطب کے پیش کردہ معیار استدلال کے مطابق اپنی دعوت کو مدلل کیا جائے۔ مخاطب جن اصطلاحوں میں بات کو سمجھنا چاہتا ہے، انھیں اصطلاحوں میں اس کو سمجھایا جائے اور اس کے مانوس فکری ڈھانچے کے مطابق اس کے لیے دین کو قابلِ فہم بنایا جائے۔

دین کو پوری طرح ماننے کے لیے "ایمان" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ایمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ داخل القلب ایمان (حجرات - ۱۴) ہو۔ یہ ایمان کسی کے دل میں اترنے کے لیے جس راستے سے گزرتا ہے، وہ عقل کا راستہ ہے۔ عقل داخلۂ ایمان کا دروازہ ہے۔ جب تک ایمان کسی کے قلب میں جاگزیں نہ ہو، اس وقت تک سوال یہ رہتا ہے کہ عقل کے دروازے میں کون سا قفل لگا ہوا ہے اور وہ کس کنجی سے کھل سکتا ہے۔ چونکہ قفل متعدد ہوسکتے ہیں، اس لیے اس پہلے مرحلے کے لیے کنجیاں بھی متعدد درکار ہوتی ہیں۔ مگر جب دروازہ کھل جائے تو اس کے بعد سوال کئی نہیں رہتے بلکہ صرف ایک بن جاتا ہے۔ جس طرح خدا ایک ہے، اسی طرح انسان کی فطرتِ صحیحہ بھی ایک ہے۔ داخل القلب ایمان حاصل ہونا گویا فطرتِ صحیحہ کی وحدت کا کائنات کی وحدت سے مربوط ہوجانا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں تعلق باللہ کا حصول کہا جاتا ہے۔ تعلق باللہ بلا تشبیہ اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جیسے میرے کمرے کے بلب اور پاور ہاؤس کے درمیان بجلی کے رشتے کا قائم ہوجانا۔ اس طرح کا تعلق باطنی طور پر ہمیشہ صرف ایک معنی رکھے گا اور وہ ہے "بجلی کی رو" مگر اس بہاؤ کو دوطرفہ قائم کرنے کے لیے سوئچ مختلف حالات میں مختلف ہوسکتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ علم کلام اصلاً معرفتِ الٰہی کا علم نہیں ہے بلکہ اثباتِ الٰہی کا علم ہے۔ اثبات و استدلال کے طریقے ہر دور میں جداگانہ ہوسکتے ہیں مگر معرفت کا علم ہر دور میں یکساں رہے گا کیونکہ

عقل انسانی ایسا کر سکتی ہے کہ اپنے دروازے کھولنے اور بند کرنے کے لیے نئے نئے تالوں اور کنجیوں کا تجربہ کرے۔ مگر خدا کے یہاں اس قسم کی تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔ خدا اپنی ذات میں ایک ازلی اور ابدی حقیقت ہے۔ اسی طرح فطرتِ انسانی کا اصل جوہر جس کے تاروں کے ذریعے خدا اور بندے کا تعلق قائم ہوتا ہے، وہ بھی ایک مستقل اور غیر تغیر پذیر حقیقت ہے۔ اس لیے تعددِ کلام کی ضرورت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک فطرتِ صحیحہ بیدار نہ ہوئی ہو۔ جب فطرت بیدار ہو جائے اور دنیائے حقیقت میں بندے اور خدا کا تعلق اپنی اصل حیثیت میں قائم ہو جائے، اس وقت وحدتِ کلام تعددِ کلام کی جگہ لے لیتی ہے۔

علم کلام کی ضرورت کے دو اور پہلو ہیں :

۱۔ ذہنی غلبہ کی فضا پیدا کرنا۔

۲۔ اتمامِ حجّت

اول الذکر پہلو کا مطلب یہ ہے کہ دین کی علمی نمائندگی کے نتیجے میں عمومی طور پر ایسی ذہنی فضا بن جائے کہ دین اور خدا کی بات ہلکی بات نہ رہے بلکہ بھاری بھرکم بات بن جائے۔

ذہنی غلبہ کی یہ فضا اسلام دو طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ ایک سیاسی قوت۔ دوسرے، عقلی استدلال۔ اگر کسی علاقے میں اسلام کا سیاسی اقتدار قائم ہو جائے تو خواہ حکومت مذہبی معاملات میں غیر جانب دار ہی کیوں نہ ہو، اسلام کے حق میں ذہنی غلبہ کی ایک فضا خود بخود قائم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آٹھ نو سو برس کی حکومت کے باوجود یہاں کے مسلم حکمرانوں نے کبھی اشاعت دین کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اس غلطی کے لیے میں انھیں معذور قرار دینے کا وکیل نہیں بن سکتا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ مسلم اقتدار نے عمومی غلبہ کی جو فضا پیدا کی، وہ تبلیغ دین کی غیر سرکاری کوششوں میں مددگار ثابت ہوئی۔ جب اس علاقے کو خراسان اور ماوراء النہر کے سیاسی حوصلہ مندوں نے فتح کیا تو اسی کے ساتھ بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے علماء قطار در قطار یہاں

آنا شروع ہوئے۔ ابتداءً ملتان اور لاہور کے علاقے ان کا مرکز بنے۔ اس کے بعد جب ۶۰۷ھ میں سلطان شمس الدین التمش نے دہلی کو دار السلطنت بنایا تو ہر طرف سے علما سمٹ سمٹ کر دہلی میں جمع ہونے لگے۔ اس طرح حکومت کے براہ راست تعاون کے بغیر، مگر اسلام کے سیاسی غلبے کی عمومی فضا میں، تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کے وہ سارے کارنامے انجام پائے جن کا نتیجہ آج ہم اس برصغیر میں ۲۰ کروڑ مسلمانوں کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

ذہنی غلبے کی اس فضا کے لیے سیاسی غلبہ ناگزیر نہیں، وہ عقلی استدلال کے ذریعہ بھی پیدا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ عقلی بنیادوں پر مبنی ذہنی فضا اتنی وسیع اور قوی شکل اختیار کر سکتی ہے کہ سیاسی غلبے سے پیدا ہونے والی فضا پر بھی بھاری ثابت ہو۔ یہاں مثال کے طور پر مغربی قوموں کی موجودہ سائنس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مغربی قوموں کا سیاسی اقتدار آج ایشیا اور افریقہ سے تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ مگر مغربی قوموں نے دماغی علوم میں جو برتری حاصل کی ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ آج بھی آزاد شدہ ممالک پر ان کا مکمل ذہنی غلبہ قائم ہے۔ کسی چیز یا کسی نظریے کا "فارن" ہونا اس کی بہتری کا ایسا ثبوت ہے جو بلا بحث تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ بن گیا ہے کہ جو چیز مغرب سے آئے وہ ضرور معیاری ہوگی۔ حالانکہ صرف چند سو برس پہلے مغربی سائنس کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ کیمسٹری، قدیم طرز کے کیمیا دانوں کے ہاتھ میں تانبے پیتل کو سونا بنانے کا ایک خبط تھا اور فلکیات پرانے نجومیوں کے ہاں لوگوں کو مستقبل کی بات بتا کر ان کو لوٹنے کی ایک بدنام تدبیر تھی۔

ذہنی مرعوبیت اور تصوراتی غلبے کی یہ فضا جب کسی تحریک کے حق میں پیدا ہو جائے تو بہت سی مصنوعی اور غیر ضروری رکاوٹیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور تحریک کی توسیع و ترقی کا کام ایک موافق فضا میں ہونے لگتا ہے۔ ذہنی غلبہ کی فضا کی مثال پختہ سڑک کی ہے۔ اگر آپ اپنی گاڑی ناہموار بیابان میں چلا رہے ہوں تو طرح طرح کی زحمتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کو ایک بنی بنائی پختہ سڑک مل جائے تو سفر نہایت تیزی اور آسانی سے ہونے لگے گا۔

علم کلام کا ایک کام اسی قسم کی ذہنی فضا پیدا کرنا ہے۔ علوم کا ایسا مطالعہ کہ وہ

اسلامی عقائد کے مؤید نظر آنے لگیں۔ تاریخ کی ایسی نقشہ کشی جس میں اسلام اپنی واقعی جگہ پالے۔ حقائق کائنات کی ایسی تعبیر جس سے اسلام کی تصدیق و تصویب ہو۔ اسلامی صداقتوں کا ایسے انداز اور ایسے دلائل کے ساتھ اظہار جو وقت کے ذہن پر عظیم سوالیہ نشان بن کر مسلّط ہو جائے۔ غرض برتر علمی تدوین اور اعلیٰ استدلال کے ذریعے لوگوں کے طرز فکر پر اس طرح چھا جانا کہ ان کی عقل کو نظر آنے لگے کہ اسلام کے سوا کوئی چیز حقیقت کے خانے میں بیٹھ ہی نہیں رہی ہے۔ جہاں اسلام کا احترام دلوں میں جگہ پا چکا ہو وہاں دعوت اسلام کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے اور یہ ایک طاقتور علم کلام کا نہایت اہم فائدہ ہے۔

علم کلام کا ایک پہلو اتمام حجت ہے۔ اتمام حجت کے معنی ہیں ثبوت کو مکمل کرنا۔ استدلال کو آخری حد تک پورا کر دینا۔ یہ کام کیونکر ہوگا۔ اس کی صرف ایک شکل ہے۔ وہ یہ کہ خود انسان کے پاس اور اس کے اپنے تجربے میں جانچنے پرکھنے کی جو صلاحیت ہے، اس کے اعتبار سے اپنے دعوے پر دلیل کو آخری حد تک پہنچا دیا جائے۔ یہ صلاحیت عقل کہلاتی ہے۔ اس لیے اتمام حجت کے معنی ہیں ــــ عقلی طور پر کسی کے لیے دین کی صداقت کو آخری حد تک ثابت شدہ بنا دینا۔ پچھلے زمانوں میں انسان کی عقل خارقِ عادت واقعات کو اپنے لیے آخری فیصلہ کن چیز سمجھتی تھی، اس لیے قدیم دور میں اکثر انبیا نے اتمامِ حجّت کے لیے خارق عادت معجزات پیش کیے۔ مگر آخری رسول کی بعثت کے بعد دنیا ایک نئے دَور میں داخل ہو رہی تھی جب کہ علم کو فیصلہ کن مقام ملنے والا تھا، اس لیے آپ کو کتابی معجزہ ــ قرآن ــ دیا گیا، جو نہ صرف اپنی ابدی صداقت کی وجہ سے ممتاز ہے بلکہ ترقی یافتہ انسانیت کی عقل کے لیے حجّت اور برہان بننے کا سارا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی جب آتا تو وہ اپنی قوم کی اپنی زبان میں خطاب کرتا۔ (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ، ابراہیم-۴) اس وقت تک کسی قوم کو منکر قرار دے کر اسے سزا نہیں دی جاتی جب تک پیغمبر کی دعوت کا اس تک پہنچنا معلوم

اور ثابت نہ ہو۔ (لم یکن ربک مھلک القریٰ بظلم و اھلھا غافلون، انعام - ۱۳۱) اتنی قوت وشدت سے دعوت پیش کی جاتی کہ مخاطب پکار اٹھتا کہ تم نے تو اپنا سبق ہم کو خوب پڑھ پڑھ کر سنا دیا ہے۔ (... ولیقولوا درست، انعام - ۱۳۱) نبوت کے لیے خصوصیت سے موزوں صلاحیتوں والی شخصیت کا انتخاب کیا جاتا۔ (اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا و من الناس، حج - ۷۵)

یہ سب کیوں تھا۔ اسی لیے کہ دعوت پہنچانے کا وہ اعلیٰ ترین معیار حاصل ہو سکے جو مخاطب کے ذہن کے اعتبار سے اس کے لیے آخری دلیل بن جائے۔ جب انکار تعقل سے محروم ہو چکا ہو اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی بنیاد اس کے پاس باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے پاس سوچنے اور رائے قائم کرنے کی جو سب سے بڑی صلاحیت ہے وہ عقل ہی ہے۔ اس لیے انسان کا یہ جرم کہ ایک بات جو حق تھی، اس کو پوری طرح سمجھ لینے کے باوجود اس نے نہیں مانا، اسی وقت متحقق ہو سکتا ہے جب اس کے اپنے عقلی معیار کے مطابق اس حق کو ثابت کر دیا گیا ہو۔ کسی اور معیار کے لحاظ سے کوئی بات خواہ کتنی ہی مسلم الثبوت کیوں نہ ہو۔ ایسے شخص کو مجرم قرار دینے کے لیے وہ کافی نہیں ہو سکتی جس نے اپنی عقل کی بساط کے مطابق اس کا برحق ہونا جان نہ لیا ہو۔ یہی چیز ہے جس کے لیے پیغمبر کشتی لڑا، جس کے لیے عصا کو سانپ کی شکل دی گئی، جس کے لیے حجت ابراہیمی ظاہر ہوئی۔ جس کے لیے قرآن کو معجزۂ ادب کی شکل میں اتارا گیا۔ دعوت کا یہ اہتمام کبھی صرف حجت کا اتمام ہو کر رہ جاتا ہے اور کبھی ذہن کے دروازے کھول دیتا ہے، جیسا کہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔

اوپر کی گفتگو نے ہم کو جس مقام پر پہنچایا ہے، اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ علم کلام کی اصل حقیقت کیا ہے۔ علم کلام کا کام اصلاً یہ نہیں ہے کہ دین کی حقیقت کو اس کے ابدی مفہوم میں بیان کرے۔ بلکہ علم کلام یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے لیے شخصی یا زمانی اسباب کی بنا پر دین، عقلی طور پر قابل فہم نہ رہا ہو، ان کے لیے دین کو عقلی اصطلاحوں میں قابلِ فہم بنا دے۔ یہ تعریف بلاشبہ ایسی نہیں ہے جو پوری صورتِ حال

کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ دوسری چیزوں کی طرح یہاں بھی استثنا نہ صرف ممکن بلکہ ناگزیر ہے مگر عمومی طور پر (ایک قابل عمل توضیح کے اعتبار سے) یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم کلام کی حقیقت یہی ہے۔

علم کلام کی یہ تعریف اس کو بیک وقت دو چیزوں سے الگ کر دیتی ہے۔ اوّل فلسفہ سے جو حقیقت کو (اس کی ذاتی حیثیت میں) فی نفسہ متعین کرنا چاہتا ہے دوسرے معروضی طریق مطالعہ Objective Study سے جو کم از کم اپنے ادّعا کے مطابق حقیقت کی غیر جانبدارانہ تحقیق کا نام ہے۔ علم کلام کے نزدیک اسلام کی حیثیت خود ایک (دریافت شدہ) مسلّم الثبوت نظام فکر کی ہے۔ علم کلام کا کام صرف اس کی زمانی تشریح اور اس کو مخصوص حالات کے اعتبار سے مدلّل کرنا ہے۔ اسی طرح نام نہاد معروضی طریق مطالعہ اختیار کرنے کا مطالبہ بھی علم کلام سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ علم کلام حقیقۃً کوئی علمی تلاش نہیں بلکہ تلاش میں کامیاب ہونے کے بعد ان عقلی دلائل کو مرتب شکل میں دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے جو خود پیش کرنے والے کے لیے متعلقہ سچائی پر مطمئن ہونے کا سبب بنے تھے۔ "اسلام ایٹ دی کراس روڈس" کے مصنف کے سامنے غالباً یہی پہلو تھا جس کی بنا پر انھیں اپنی کتاب کے آغاز میں کہنا پڑا:

It does not pretend to be a dispassjonate survey of affairs: It is the statement of a case: the case of Islam versus Western civilization.

(یعنی اس کتاب میں ٹھنڈے دل سے غیر جانبدارانہ جائزے کا انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے، اس کا انداز ایک مقدمہ جیسا ہے۔ اسلام کا مقدمہ مغربی تہذیب کے نام)

اسلامی دعوت بیک وقت اپنے ساتھ دو متضاد تقاضے رکھتی ہے۔ ایک طرف اس کو اس نازک مگر دائمی رشتہ کی وضاحت کرنی ہے جو بندے اور خدا کے درمیان اس وقت قائم ہوتا ہے جبکہ وہ ایمان کی دولت کو پا گیا ہو۔ یہ ایک ابدی آواز ہے جس کو ابدی الفاظ میں بیان کرنا ہے۔ دوسری طرف اسلامی دعوت کا ایک پہلو یہ ہے کہ

(ذہنوں میں تقریب پیدا کی جائے اور) دین کو قابلِ فہم بنانے کے لیے اس کو مخاطب کے عقلی معیار کے مطابق ثابت کیا جائے۔ یہ دوسری چیز، اوّل الذکر کے برعکس، بڑی حد تک زمانی نوعیت کی حامل ہے۔ چونکہ انسان کا عقلی معیار اس کی معلومات کے تابع ہے اور یہ معلومات دن بدن بڑھتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے عقلی معیار بھی اس کے ساتھ تغیر و تبدل کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ وقتی اصطلاحوں میں دائمی حقیقت کی تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ امام رازی کی تفسیر کے فلسفیانہ اور طبیعیاتی مباحث آج بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔

بلاشبہ اسلامی دعوت میں ان دونوں پہلوؤں کی اہمیت ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مستثنیٰ حالات کو چھوڑ کر دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کا بدل نہیں بنایا جاسکتا۔ جب بھی ہم ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھیں گے، بیشتر حالات میں کوئی ایک یا دونوں مقصد مجروح ہوجائیں گے۔ اس لیے عملی بات یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تقسیم عمل کے اصول کو مان لیا جائے۔ تشریح دین کا علم مثبت دائرے کے لیے ہے اور علم کلام اس کے مقابلے میں دفاعی یا منفی دائرے میں اپنی خدمت انجام دیتا ہے۔ اول الذکر کا کام دین کو ایک مطلق صداقت کی حیثیت سے ظاہر کرنا ہے۔ جبکہ ثانی الذکر سے بنیادی طور پر جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ مخاطب کی ذہنی رکاوٹوں کو دور کرے تاکہ وہ اصل دعوت کو سمجھ سکے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ مثبت تعبیرات منفی استدلال کے لیے بالکل غیر مفید ہیں یا یہ کہ منفی استدلال کا مثبت تعبیر کے لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں۔ نازک علمی مسائل، وہ بھی ایسے مسائل جن کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہو، اس طرح کی منطق تقسیم قبول نہیں کرتے۔ دونوں مختلف پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور اکثر حالات میں ایک دوسرے کے لیے معین و مددگار بھی۔ تاہم نوعیت کے فرق کو سمجھنے کے لیے دونوں کے درمیان اس قسم کی تقسیم ناگزیر ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ فلسفہ اور علم کلام دونوں ہم معنی الفاظ

نہیں ہیں، جیسا کہ ماضی میں غلطی سے سمجھ لیا گیا تھا۔ ایک زمانے میں فلسفہ عام طور پر مذہب کے ایک شعبے کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ اس زمانے میں فلسفہ کا کام زیادہ تر یہ تھا کہ مذہبی عقائد کو فلسفیانہ اصطلاحات میں بیان کر دیا جائے۔ یہ فلسفہ جب عباسی دَور میں (ترجمہ ہو کر) مسلم سوسائٹی میں پھیلا تو ابتداءً بہت سے لوگوں کو توحش ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ مذہب کے بالمقابل کوئی اور چیز ہے۔ بعد کو زیادہ تحقیق سے سمجھ میں آیا کہ زیادہ تر فرق صرف اندازِ اظہار کا ہے۔ ورنہ فلسفہ اور مذہب میں کوئی تضاد نہیں۔ چنانچہ فلسفہ میں تھوڑا سا ردوبدل کر کے اس کو مسلمان بنا لیا گیا اور اسی مسلمان فلسفے نے بالآخر علمِ کلام کی شکل اختیار کر لی۔

اس واقعہ سے یہ فائدہ تو ہوا کہ فلسفہ اور مذہب دو متصادم چیزیں نہیں رہیں بلکہ فلسفہ خود مذہب کا خادم اور مؤید بن گیا۔ مگر اس ترکیب نے علمِ کلام میں ایک غلطی بھی شامل کر دی۔ وہ یہ کہ علمِ کلام کے موضوعات وہی بن گئے جو خود فلسفہ کے موضوعات تھے۔

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

ثم لما نقلت الفلسفة عن اليونانية الى العربية وخاض فيها الاسلاميون و حاولوا الرد على الفلاسفة فيما خالفوا فيه الشريعة فخلطوا بالكلام كثيرا من الفلسفة ليحققوا مقاصدها فيتمكنوا من ابطالها وهلم جرا الى ان ادرجوا فيه معظم الطبيعيات والالٰهيات وخاضوا فى الرياضيات حتى كاد لا يتميز عن الفلسفة لولا اشتماله على الالٰهيات

شرح العقائد النسفیہ، صفحہ ۶

پھر جب فلسفہ یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوا اور مسلمان اس میں گھسے اور انھوں نے فلاسفہ کا ان مسائل میں رد کرنے کا ارادہ کیا جو شریعت کے خلاف تھے تو انھیں اپنی بحث میں فلسفہ کا کافی حصہ لینا پڑا تاکہ وہ فلسفہ کے اصل مسائل کو محقق کر دیں اور پھر ان کا غلط ہونا ثابت کر سکیں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے فلسفہ میں طبیعیات اور الٰہیات کا بھی بڑا حصہ لے لیا۔ اسی طرح مسلمان ریاضی کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میں ایسا گھسے کہ اگر اس میں الٰہیات کا حصہ نہ ہوتا تو اس کو فلسفہ سے ممتاز کرنا دشوار ہو جاتا۔

فلسفہ کا کام اصلاً حقیقت کی علمی دریافت تھا۔ نیز اپنی فطرت کے اعتبار سے وہ حقیقت کو اس کی آخری حدود تک متعین کرنا چاہتا تھا۔ جب دونوں علوم باہم مخلوط ہوئے تو نتیجہ یہ ہوا کہ علم کلام نے بھی اپنے ذمہ یہی کام لے لیا اور یہ کوشش شروع کر دی کہ حقیقت کے بارے میں فلسفہ کے پیدا کردہ تمام سوالات کا جواب اس طرح دیا جائے کہ حقیقت اپنی آخری شکل میں متعین ہو کر سامنے آ جائے۔

اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ ملت کے عام اور معروف عقائد کے بالمقابل عقائد کا ایک طویل مجموعہ تیار ہو گیا۔ یہ مجموعہ نہ صرف امت کے اصل عقائد پر اضافہ تھا بلکہ بہت سے پہلوؤں سے وہ قرآن وسنت کے اسلام سے ٹکرانے والا تھا۔ پھر جب متکلمین کے موضوعہ عقائد کے لوازم ونتائج پر نظر گئی تو معلوم ہوا کہ یہ شریعت سے الگ ایک شریعت ہے جس نے خدا کے قرآنی تصوّر تک کو بدل ڈالا ہے۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس نے متکلمین اور محدثین کے درمیان زبردست کش مکش پیدا کر دی اور وہ سارے ناخوشگوار واقعات وجود میں آئے جن کو ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کلام کا کام اصلاً دفاعی ہے نہ کہ اثباتی۔ یعنی علم کلام کو یہ نہیں بتانا ہے کہ دین کیا ہے۔ اس کو صرف یہ کرنا ہے کہ دین کے خلاف جو علمی حملے یا اس کی راہ میں ذہنی رکاوٹیں ہیں، ان کا فکری سطح پر مقابلہ کر کے انھیں ختم کر دے۔ دوسرے لفظوں میں علم کلام کا کام ذہنی میدان میں وہی ہے جو بدر وحنین کے معرکے میں تلوار کا۔ تلوار، بلاشبہ اسلام کے دفاع کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر تلوار کو توجیہہ دین کے مقام پر رکھ دیا جائے تو پھر وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو "بیلچہ پارٹی" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح علمِ کلام اگرچہ اسلام کے دفاع کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اگر اس کو دین کی فلسفیانہ توجیہہ کے لیے استعمال کیا جانے لگے تو وہ چیز وجود میں آئے گی جس کو ایک مصنّف نے "فنی مفروضات" کا نام دیا ہے اور جو مصنّف مذکور کے الفاظ میں "ایک ایسا اسلام ہے جس کو ملّت کے عقائد سے ذرا تعلق نہیں"۔ مثال کے طور پر تفسیر بیضاوی کے آغاز میں "رحمان" کی حقیقت کی طویل بحث، جو صرف اس لیے

پیدا ہوئی ہے کہ ذہن رحمانیت کو فلسفیانہ سوالات کی روشنی میں متعین کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ سادہ طور پر سمجھنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہمارے اعمال کی جو جزا خدا کی طرف سے ملتی ہے، اسے مجازاً رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قدیم فلسفہ کے اتباع میں متکلمین نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ عرض قائم بالغیر ہوتا ہے اور اس کا وجود آنی اور فانی ہے۔ اس فلسفیانہ مسئلے کو علم کلام میں شامل کرنے کی وجہ سے بہت سے غیر ضروری مسئلے پیدا ہو گئے۔ اس کی وجہ سے اعمال کے وزن کو سمجھنا ناممکن ہو گیا۔ افعال کے صدور سے قبل استطاعت کا وجود محال قرار پایا۔ قیامت کے دن ہاتھ پاؤں کی شہادت ناقابلِ تصور ہو گئی۔ حدیث میں تھا کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان، اس کی کوئی اصلیت باقی نہیں رہی۔ وغیرہ۔

علم کلام کو فلسفے سے مخلوط کرنے کی یہ غلطی اس طرح پھیلی کہ بعد کے لوگ بھی اپنے آپ کو اس سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر اقبال جب "الٰہیات اسلامی کی تشکیل جدید" کرنے بیٹھے تو وہ بھی اس میں مبتلا ہو گئے۔ مثلاً اسلام کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد جنّت اور جہنم ہے۔ اس عقیدے کے سلسلے میں بہت سے فلسفیانہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ جنّت اور جہنم مادّی ہیں یا غیر مادّی۔ ڈاکٹر اقبال نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی تو انھیں کہنا پڑا:

Heaven and Hell are states, not localities.

(جنت اور جہنم احوال ہیں، مقامات نہیں) یہ الفاظ ڈاکٹر اقبال کے قلم سے اس لیے نکلے کہ اس کے بغیر جنت اور جہنم کا عقیدہ ان کو فلسفے کے ڈھانچے میں بیٹھتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ مگر عین اس وقت جب وہ سمجھ رہے تھے کہ دین کو فلسفے کے ڈھانچے کے اندر بٹھانے میں وہ کامیاب ہو چکے ہیں، دین کا اصل عقیدہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس کے برعکس اگر علم کلام کو وہ اپنی حدود میں رکھتے تو وہ صرف یہ ثابت کرنے پر قناعت کرتے کہ مرنے کے بعد بہر حال ایک ایسا انجام سامنے آنے والا ہے جو اپنی نوعیت میں ویسا ہی ہوگا جس کو مذہب نے انسانی الفاظ میں جنت اور جہنم سے تعبیر

کیا ہے۔ باقی یہ سوال کہ وہ مادّی ہے یا غیر مادی، اس کا علم کلام سے تعلق نہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے فلسفے کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

ایک چیز ہے دین کی واقعیت اور ایک چیز ہے دین کی نوعیت۔ جب علم کلام کو دفاعی مقصد تک محدود رکھا جائے تو اس کا کام ہوتا ہے دین کی واقعیت کو چیلنج کرنے والوں کے مقابلے میں دین کی واقعیت ثابت کرنا۔ اس کے برعکس جب علم کلام کو اثباتی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کلامی زبان میں دین کی حقیقی نوعیت کی تفصیل کر رہے ہیں۔ جبکہ خود دین میں اس طرح کی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں بلکہ صریح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کی تفصیلات متعین کرنے کے پیچھے نہ پڑو:

وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنها	اور اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کے بارے میں بغیر بھولے ہوئے سکوت اختیار کیا ہے تو اس کے بارے میں خوض نہ کرو۔

شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بنیاد پر کہا تھا:

ابهموا ما ابهمه الله *میر الروایات	اللہ نے جس کو مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم رکھو۔

ظاہر ہے کہ جن باتوں کی حقیقت اللہ نے بیان نہ فرمائی ہو، اس کے متعلق آپ کا بیان لامحالہ انسانی علم کی بنیاد پر ہوگا۔ ایسی حالت میں آپ کے بیان کا دو میں سے کسی ایک غلطی کا شکار ہونا لازمی ہے۔ حقیقت کی تفصیلی نوعیت اگر انسان کے لیے ناقابلِ ادراک ہے اور اسی بنا پر اللہ تعالےٰ نے اس سے سکوت اختیار فرمایا ہے، تو انسانی علم بھی اس کے ادراک سے ہمیشہ قاصر رہے گا۔ ایسی حالت میں مجرد علم انسانی کی بنیاد پر جو تشریح کی جائے گی وہ لازمی طور پر غلط ہوگی اور اگر بالفرض اس کو قابل ادراک مانا جائے، جب بھی اس معاملے میں، کم از کم موجودہ انسانی علم کوئی صحیح بنیاد فراہم کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا کیونکہ یہ انسانی علم خود اپنے اعتراف کے مطابق ابھی ارتقائی مرحلے میں ہے۔ اس کو کسی بھی درجہ میں یہ دعویٰ نہیں کہ وہ حقیقت کے آخری عرفان تک پہنچ گیا ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اگر ہم موجودہ انسانی علم کی بنیاد پر حقیقت الحقائق کی تفصیلی نوعیت متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ کوشش زمانی معیار کی روشنی میں دائمی حقیقت کو متعین کرنے کی کوشش ہوگی جو بالفرض آج غلط نظر نہ آئے، جب بھی آئندہ یقینی طور پر غلط ثابت ہوگی۔

انسان کی تمام غور وفکر اپنی معلومات کے دائرے میں ہوتی ہے۔ معلومات کے باہر آدمی کوئی تصور قائم نہیں کر سکتا۔ انسان اپنے حواس کے ذریعہ معلومات اخذ کرتا ہے اور پھر عقل ان سے کلیات بناتی ہے اور انھیں کلیات کے بارے میں غور وفکر کرتی ہے۔ جو چیزیں ہمارے محسوسات سے باہر ہیں، ان کے معاملے میں وحی والہام کے بغیر مجرد عقل کام نہیں کر سکتی۔ متکلم کے لیے ضروری ہے کہ اس فرق کو واضح طور پر اپنے سامنے رکھے ورنہ وہ خود بھی غلط رائے قائم کرے گا اور دوسروں کو بھی غلطی میں مبتلا کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین نے روح (وحی) کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا، اس کے جواب میں روح کی اصل حقیقت پر بحث نہیں چھیڑ دی گئی بلکہ یہ جواب دیا گیا:

یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا

وہ تجھ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں کہدو کہ روح خدا کے حکم سے ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اسراء – ۸۵

علم کلام کی جس حد بندی کی ہم نے وکالت کی ہے۔ اس کے سلسلے میں یہ آیت بہت اہم بنیاد کا کام دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دائرۂ فہم کے اندر رائے قائم کر سکتا ہے جو فطرت کی طرف سے اسے دیا گیا ہے۔ اس دائرے سے باہر جا کر رائے قائم کرنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ اس لیے حقیقت پسندی یہ ہے کہ جو امور ہمارے دائرۂ فہم کے اندر ہوں، ان کے بارے میں آخری حدود تک جانے کی کوشش کریں۔ مگر جو امور عقل کے دائرے سے باہر ہوں، ان میں مجمل اثبات پر قناعت کریں۔

قدیم زمانے میں یہ بات ممکن ہے صرف مذہبی عقیدہ نظر آتی ہو۔ مگر آج وہ سائنسی امر واقعہ بن چکی ہے۔ انیسویں صدی کی سائنس کے برعکس آج کی سائنس متفقہ طور پر یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ حقیقت الحقائق انسانی عقل یا ریاضیاتی پیمائیشوں سے باہر کی چیز ہے۔

اس کے بارے میں ہم یہی کر سکتے ہیں کہ بعض خارجی علامات کی بنا پر ایک قیاسی رائے قائم کریں۔ دوسرے لفظوں میں سائنس کا سفر ایک حد کے بعد اس مقام پر آجاتا ہے جہاں مجمل ایمان کے بغیر چارہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں جدید سائنس نے تقریباً وہی موقف اختیار کر لیا ہے جس کی طرف قرآن نے ڈیڑھ ہزار برس پہلے نشاندہی کی تھی۔

قرآن کی ایک اور آیت ہے :

هو الذی انزل علیک الکتاب منه آیات محکمات هن ام الکتاب واخر متشابهات فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنه وابتغاء تاویله۔ وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم یقولون آمنا به کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب

آل عمران – ۷

اللہ نے تم پر کتاب اتاری جس کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو محکم ہیں۔ یہ ام الکتاب ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ سو جن کے دل میں کجی ہے وہ اس کے اس حصے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو متشابہ ہیں، فتنہ ڈھونڈنے کے لیے اور تاویل ڈھونڈنے کے لیے۔ حالانکہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ یوں کہتے ہیں ہم اس پر اجمالاً یقین لائے۔ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ جو حقیقتیں انسان پر ظاہر کی گئی ہیں، وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن کو محکم الفاظ کی شکل میں بتایا گیا ہے۔ دوسرے وہ جن کا نزول تشبیہی الفاظ کے ذریعہ ہوا ہے۔ اول الذکر کا تعلق اس دنیا سے ہے جو پوری طرح ہماری عقل کی گرفت میں آتی ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں محکم بات بتا دی گئی۔ ثانی الذکر کا تعلق اس دنیا سے ہے جو براہِ راست ہماری محدود عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس لیے ان کو تشبیہی الفاظ کے ذریعہ بتایا گیا۔ جیسے ایٹم کے نظام کو سمجھانے کے لیے شمسی نظام کی مثال دی جائے۔

محکم اور متشابہ کے فرق کو ربوٰا اور جنت و جہنم کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ربا (سود)

کی حرمت کا معاملہ انسانی دائرے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اس کی بحث میں یہ کوشش بالکل صحیح اور جائز ہوگی کہ اس کے نفع وضرر کو آخری حد تک معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں ہم کو مثالوں کا سہارا لینے یا اجمالی عقیدے پر قناعت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر جنّت اور جہنم کا معاملہ ایک ایسی دنیا سے تعلق رکھتا ہے جس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کوئی زندہ آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے۔ اس لیے اس کی بحث میں ہمیں اس پر اکتفا کرنا پڑے گا کہ مجرد اس کے امکانی وجود کو ثابت کرنے تک اپنی گفتگو کو محدود رکھیں۔ اس کی تفصیلی نوعیت متعین کرنے کے چکّر میں نہ پڑیں۔ اگر ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرنے لگیں کہ جنّت اور جہنم احوال ہیں یا مقامات، تو یہ انسانی عقل کے دائرے سے باہر قدم رکھنا ہوگا۔ خوش قسمتی سے عصر حاضر کا سائنسی طرزِ فکر بعینہٖ یہی ہے۔

آج کا ایک سائنس دان یہ ثابت کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کرتا کہ مکان Space, خارجی چیز Objective, ہے یا داخلی Subjective ۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے دائرہ امکان سے باہر ہے کہ اس کی حقیقی حیثیت متعین کر سکے۔ وہ "مکان" پر گفتگو کرتا ہے نہ اس پر کہ وہ خارجی ہے یا داخلی۔ اس قسم کے مسئلہ کو سائنس میں داخل کرنا سائنس کو فلسفہ بنا دینا ہے، بالکل اسی طرح جیسے قدیم متکلمین نے علم کلام کو فلسفہ بنا دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا معاملہ "متشابہات" کے قبیل سے ہے۔ یعنی انسان موجودہ عقل کے ساتھ چونکہ ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا، اس لیے ان کو تشبیہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اس بحث میں متکلمین کی صرف وہ باتیں ٹھیک کہی جا سکتی ہیں جو وحی کے ظاہری الفاظ سے ماخوذ ہیں۔ جہاں انھوں نے ایسی باتیں کہی ہیں جن کی کوئی بنیاد وحیٔ الہام میں نہیں ہے اور وہ محض عقل کی پیداوار ہیں۔ ان کی صداقت نہ صرف مشکوک قرار پاتی ہے بلکہ خود یہ امر مشتبہ ہے کہ اس ممنوعہ حد میں قدم رکھنا ان کے لیے جائز تھا یا نہیں۔ مثلاً اتنی بات تو یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بہت سی صفات ثابت کی ہیں۔ لیکن ان صفات کی کیفیت ونوعیت کہ وہ صفات حادث ہیں یا قدیم ہیں، عین ذات ہیں

یا غیر ذات ہیں، یا لاعین ولاغیر کی بحث، اس قسم کی تمام باتیں محض اپنی عقل سے نکالی ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ متکلمین نے یہاں علم کلام کے دائرہ سے باہر قدم رکھا ہے۔

البتہ اس میں بعض استثنائی صورتیں ہیں مثلاً چونکہ وحی کی بنا پر یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات خود قدیم ہے اور اس کے سارے ذاتی کمالات بھی قدیم ہیں، لہٰذا جو لوگ صفات کو حادث کہتے ہیں ان کی غلطی یقینی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ صفات الٰہی کو قدیم کہتے ہیں، اگرچہ مجرد عقل سے کہتے ہیں، ان کی رائے صحیح ہے۔ مگر صفات کا عین ذات ہونا یا غیر ذات ہونا، یا لاعین اور لاغیر کا نظریہ، یہ سب نہ مجرد عقل سے معلوم ہو سکتا ہے اور نہ وحی و الہام اس بارے میں رہنمائی کرتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی تشریحات میں اگر خوض نہ کیا جائے اور صفات الٰہی کے مجرد اثبات پر اکتفا کی جائے تو یہ زیادہ صحیح بات ہے اور یہی قرن اول کے لوگ کرتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ پھر بھی بعض پہلوؤں سے علم کلام کو ایسے الفاظ استعمال کرنے پڑیں گے جو اپنے اندر زمانی قدر رکھتے ہوں اور جن کے متعلق یہ امکان ہو کہ مستقبل میں وہ اپنی موجودہ قدر کھو سکتے ہیں۔ مگر اس اندیشہ کو ضرورۃً اس لیے گوارا کیا جائے گا کہ بوقتِ استدلال وہ بہر حال مخاطب کے اوپر حجت ہیں۔ اور جہاں تک آئندہ کا تعلق ہے، ان سے نفس دین میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔

جب دین کی واقعیت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی مواد استدلال کو استعمال کیا گیا ہو تو اس بنا پر دین کی حقیقت پر کوئی حرف نہیں آتا کہ اس مواد کے کسی جزء نے بعد کے زمانے میں اپنا وزن کھو دیا ہے۔ ایسا کوئی واقعہ صرف مواد استدلال کو متاثر کرتا ہے نہ کہ موضوع استدلال کو۔ دین کی واقعیت اصولاً صرف اس وقت مشتبہ ہو سکتی ہے جبکہ مواد کی کمزوری ثابت ہونے کے بعد کوئی دوسری دلیل اس کی صحت کو ثابت کرنے کے لیے باقی نہ رہے۔ جبکہ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ دین ایک دائمی اور قطعی صداقت ہے اور ہر زمانے میں اس کے حق میں استدلال کے لیے قوی سے قوی تر مواد حاصل ہوتا رہا ہے۔

متکلمین کی محولہ بالا غلطی کا اعادہ منطق کے استعمال میں بھی ہوا۔ منطق میں جن طریقوں سے کسی چیز کے حق میں حجت قائم کی جاتی ہے، اس کی چھ قسمیں بتائی گئی ہیں — برہان، جدل، سفسطہ، خطابت، شعر، مغالطہ۔

برہان اس قیاس منطقی کو کہتے ہیں جس کے مقدمات یقینی طور پر صادق ہوں۔ جدل وہ قیاس ہے جس کے مقدمات اگرچہ مدعی کے نزدیک صادق نہ ہوں مگر خصم ان کو صادق مانتا ہو۔ ایسے مقدمات سے جو قیاس مرکب ہوتا ہے اس سے مقصود صرف خصم کو ساکت کرنا ہوتا ہے نہ کہ کسی بات کو ثابت کرنا۔ سفسطہ وہ قیاس ہے جس کے مقدمات صادق تو نہیں ہوتے لیکن بادی النظر میں صادق معلوم ہوتے ہیں۔ سفسطہ کے معنی ملمع کرنے کے ہیں۔ یعنی کاذب مقدمات پر صدق کا ملمع کر دیا گیا ہو۔ خطابت وہ قیاس ہے جو ایسے مقدمات سے مرکب ہوتا ہے جن کے لیے نہ صادق ہونا ضروری ہو گا نہ کاذب۔ اگرچہ احتمال دونوں کا ہوتا ہے۔ چونکہ عوام میں وہ مقبول ہوتے ہیں، اس لیے ایسے مقدمات سے جو قیاس مرکب ہوتا ہے، اس کے نتیجے سے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ شعر وہ قیاس ہے جس کے مقدمات زیادہ تر غلط اور کبھی صحیح بھی ہوتے ہیں۔ اس قیاس سے مقصود مخاطب میں کوئی خاص کیفیت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ دھوکا دینا مقصود نہیں ہوتا۔ مغالطہ وہ قیاس ہے جس میں محض غلط اور جھوٹے مقدمات سے کام لیا جائے۔ اس سے مقصود مخاطب کو دھوکے اور غلطی میں ڈالنا ہوتا ہے۔

منطق کے معاملے میں متکلمین کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر جدلیات وغیرہ سے کام لیا، دلائل و براہین کو استعمال نہیں کیا۔ انھوں نے منطقی اسلحہ خانے کے صرف وہ ہتھیار لیے جو دشمن سے لڑنے کے واسطے ہوتے ہیں اور منطق کے ان طریقوں سے کام نہیں لیا جن سے مخاطب کو متاثر اور مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ منطق انھیں دونوں چیزیں دے رہی تھی مگر انھوں نے پہلی کو لیا اور دوسری کو چھوڑ دیا۔ اگرچہ بعض مستثنیٰ مثالیں بھی ہیں مگر اکثریت کے اعتبار سے صورت حال یہی ہے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے یہاں وہ علم کلام وجود میں آیا جو "دلوں کو کھولنے کے بجائے

دلوں کے دروازے بند کرنے والا" تھا۔ اس نے داعی اور مدعو کی گفتگو کو شطرنج کا کھیل بنادیا جس میں آدمی پہلے سے سیکھی ہوئی چالوں کے ذریعہ فریق ثانی کو زک دینے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ آدمی کو گھیر کر منطقی تدبیروں سے چت کردینا، یہ علم کلام کا کمال بن گیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوشش کو ایک ذہنی کھیل تو قرار دیا جاسکتا ہے مگر اسلام کی دعوت کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ تاہم اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ خود علم کلام کی خرابی نہیں ہے بلکہ منطق کے غلط استعمال کی خرابی ہے۔ علم کلام میں وہ اس لیے داخل ہوگئی کہ اسی طریقے کو علم کلام کی بنیاد فرض کرلیا گیا۔ مناظرہ، جس نے دعوت کے کام کو ایک "بازی" بنا دیا اور مناظرہ بازی کا فن وجود میں آیا، وہ زیادہ تر اسی غلطی کا نتیجہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ علم کلام، اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، نام ہے اس بات کا کہ دین کو عقل کے ذرائع سے ثابت کیا جائے۔ چونکہ انسان کے اپنے پاس کسی بات کو سمجھنے کا واحد ذریعہ عقل ہے، اس لیے اسلام عقل کے ذریعہ اپنی بات سمجھا کر انسان کو مطمئن کرتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں جب یونان کی منطق وفلسفہ ترجمہ ہو کر مسلمانوں کے اندر پھیلے تو لوگوں نے سمجھا کہ یہ بہترین عقلی ذریعہ ہے جس سے دین کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ اندازہ صحیح نہیں تھا۔ چنانچہ علم کلام کو یونانی منطق وفلسفہ پر ڈھالنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم کلام ایک فرضی اور قیاسی علم بن گیا جس کا تعلق حقیقت کی دنیا سے نہ تھا۔

یہ کام اس وقت ہوا جبکہ خود قرآن میں علم کلام کی دوسری بنیاد موجود تھی۔ وہ تھی تخلیق کائنات کی بنیاد جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ حق کی بنیاد پر ہے:

ماخلقنا السماوات والارض وما بینہما الا بالحق احقاف - ۳

ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ اس کے اندر اثبات حق کا سارا مواد چھپا ہوا ہو۔

زمین وآسمان کی تخلیق میں اثبات دین کی جو حقیقی بنیاد تھی، وہ ارسطو کی منطق کی خیالی بنیادوں سے زیادہ قوی تھی۔ قدیم زمانے میں لوگوں کو قرآن کی اس کلامی بنیاد کی اہمیت سمجھ میں نہ آتی ہو۔ مگر موجودہ زمانے میں سائنس نے قرآن کے اشارات کو

تفصیلات کی صورت دیدی ہے اور قرآن کے اجمالی دلائل کو مکمل اور متعین دلائل بنا دیا ہے۔ اب یہ سمجھنا نہایت آسان ہوگیا ہے کہ قرآن کی کلامی بنیاد وہی واحد بنیاد ہے جس پر علم کلام کی تعمیر کی جانی چاہیے۔ یہ وہ علم کلام ہوگا جو آدمی کے لیے آیت ہوگا، جو اس کو ذکر کرنے والا بنائے گا، دینی فکر کی صلاحیت پیدا کرے گا، جس کے بعد آدمی کا دل پکار اٹھے گا کہ حق یہی ہے، جو آدمی کو آخرت کے احساس سے سرشار کردے گا، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

ان فی خلق السماوات والارض واختلاف اللیل والنھار لآیات لاولی الالباب۔ الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السماوات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا، سبحانک فقنا عذاب النار

آل عمران: ۱۹۰-۱۹۱

بلاشبہ آسمان اور زمین کے بنانے میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں، نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے جو کہ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بیٹھے اور لیٹے۔ اور غور کرتے ہیں آسمان اور زمین کے پیدا ہونے میں، وہ پکار اٹھتے ہیں، اے رب تونے اس کو عبث پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے سو بچا ہم کو آگ کے عذاب سے۔

استدلال کا یہ طریقہ تقریباً وہی ہے جس کو فلاسفہ Arguments from design کہتے ہیں۔ یہاں میں عہد حاضر کے ایک مشہور ترین منکر خدا کا ایک اقتباس نقل کروں گا جس نے صریح طور پر اس طریق استدلال کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ برٹرینڈرسل (۱۸۷۲-۱۹۷۰) اپنی کتاب "میں کرسچین کیوں نہیں" کے آغاز میں لکھتا ہے:

"It is true that scholastics invented what professed to be logical arguments proving the existence of God, but the logic to which these traditional arguments appealed is of an antiquated Aristotalian sort which is now rejected by practically all logicians.... there is one of these arguments which is not purely, I mean the arguments from design. This argument, however. was destroyed by Darwin.

ترجمہ : یہ صحیح ہے کہ علمائے مذاہب نے کچھ ایسی دلیلیں ایجاد کی ہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ منطقی دلائل ہیں اور ان سے خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے مگر وہ منطق جس پر ان روایتی استدلالات کی بنیاد قائم ہے، ارسطو کی قدیم منطق ہے جس کو عملاً اب تمام علمائے منطق رد کر چکے ہیں۔ ہاں ان دلائل میں ایک دلیل ایسی ضرور ہے جو خالص منطقی نہیں ہے۔ میری مراد نظم کائنات کی دلیل سے ہے۔ مگر ڈارون نے اس دلیل کو ختم کر دیا ہے۔"

برٹرینڈ رسل نے مذکورہ استدلال کا وزن تسلیم کرتے ہوئے ڈارونزم کے حوالے سے اس کو رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر کائنات کا نظم تو ایک واقعہ ہے جبکہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء کوئی ثابت شدہ واقعہ نہیں۔ وہ صرف ایک کام چلاؤ نظریہ Workable Theory ہے اور ظاہر ہے کہ محض ایک کام چلاؤ نظریے کی بنیاد پر کسی چیز کی واقعیت کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

توہماتی مذہب کو دیکھ کر ایک شخص نہایت آسانی سے یہ خیال قائم کر لیتا ہے کہ مذہب توہم پرستی کا نام ہے، یہی حال علم کلام کی اس شکل کا ہے جو آٹھ سو برس پہلے یونانی فلسفے کی زمین پر وجود میں آئی اور بعد کو صدیوں تک ہمارے دینی نصاب تعلیم کا ایک لازمی جزء بنی رہی۔ آج جب علم کلام کا لفظ بولا جاتا ہے تو فوراً ذہن اس مخصوص علم کی طرف چلا جاتا ہے جو حقیقۃً علم کلام کی تاریخ کا ایک جزء ہے نہ کہ کُل علم کلام۔

ایک بزرگ نے علم کلام پر تنقید کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی (صاحب الکلام) کا یہ "اعتراف" نقل کیا ہے:

فلسفی سر حقیقت نتوانست کشود
گشت راز دگر آں راز کہ افشا می کرد

شعر میں "فلسفی" کی نارسائی کا ذکر ہے نہ کہ متکلم کی۔ مگر قدیم متکلمین کے تتبع میں علم کلام اور فلسفہ کو ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں علم کلام حقیقۃً

علم دعوت ہے۔ جبکہ فلسفہ خود ایک مذہب ہے جو کسی چیز کو پہلے سے تسلیم کیے بغیر مجرد عقلی ذرائع سے حقیقت کی تلاش کرتا ہے۔

علم کلام کا یہ غلط تصور صرف ایک علمی اور فنی غلطی نہیں ہے بلکہ پچھلی صدیوں میں ہمیں اس کی وجہ سے زبردست نقصانات پہنچے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہمارے یہاں سنجیدہ طبقے میں یہ ذہن بن گیا کہ دعوت و تبلیغ کے لیے علم کلام کوئی اچھا معاون نہیں ہے کیونکہ وہ زیادہ تر کج بحثی کا محرک ہوتا ہے۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ قدیم محدثین کی طرح بعد کے صوفیا نے بھی اس کو ترک کرنا ضروری سمجھا اور دوسری انتہا پر پہنچ گئے۔ انھوں نے سمجھا کہ کراماتی طریقۂ تبلیغ کی راہ میں زیادہ بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہ طرزِ فکر اگرچہ جزوی صداقت کا حامل تھا مگر اسی کے ساتھ نقصان کا پہلو لیے ہوئے تھا۔

اس کی وضاحت ایک مثال سے ہو جائے گی۔ ہندوستان کی جو قومیں صوفیا کی تبلیغ سے مسلمان ہوئیں، ان میں عام طور پر بدعات و توہمات کا اس سے زیادہ زور ہے جتنا ان مسلم خاندانوں میں جو مسلم اقتدار کے زمانے میں باہر سے آئے اور یہاں آباد ہو گئے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ بالکل سادہ ہے۔ صوفیاء کے ذریعے جو لوگ مسلمان ہوئے وہ عام طور پر کسی ذہنی و فکری انقلاب کے نتیجے میں مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ دعا و تعویذ اور کشف و کرامات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بالکل فطری طور پر اپنے ساتھ وہ تمام رسوم و رواج بھی لے آئے جو ان کے اپنے پچھلے سماج میں ہزاروں برس سے چلے آ رہے تھے یہ رسوم و رواج ان کے مسلمان ہونے کے باوجود، کہیں بالکل سابقہ حالت میں باقی رہے جیسا کہ ہریانہ کے میواتیوں اور راجستھان کے میراتیوں کی مثال میں نظر آتا ہے اور کہیں ان رسوم و رواج میں صرف اتنا تصرّف ہوا کہ ان کو اسلامیا لیا گیا، جیسے ڈھ وارہ کی جگہ شہید وارہ وغیرہ۔

صوفیاء کے طریق تبلیغ کے برعکس علم کلام کا طریق تبلیغ فکری تبدیلی اور ذہنی انقلاب کی طرف سے اپنا عمل کرتا ہے۔ اس لیے جب کوئی اس راستے سے اسلام کو اختیار کرتا ہے تو وہ مکمل شعور کے ساتھ ایک مجموعہ عقائد کو چھوڑ کر دوسرے مجموعہ عقائد کو اپناتا ہے۔ اس لیے فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے زیرِ اثر جو شخص اپنا مذہب بدلتا ہے وہ

پورے معنوں میں ایک نیا اور مختلف انسان بن جاتا ہے۔

یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ علمِ کلام، اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے، عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں تعلیم بالقلم (علق) کہا گیا ہے۔ یعنی علم و فکر کی راہ سے کسی کے اندر نفوذ کرنے کی کوشش کرنا۔ اللہ تعالے نے اسی طریقے کو اپنا طریقہ بتایا ہے:

علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم — خدا نے قلم کے ذریعے تعلیم دی، انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

تمام انبیاء اپنی مخاطب قوموں کی ذہنی سطح اور زمانی حالات کے مطابق اسی ڈھنگ پر دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔

آخر میں ایک اور بات کا ذکر کرنا ضروری ہے، ورنہ علمِ کلام کی بحث ادھوری رہ جائے گی۔ اوپر میں نے علم کلام پر جو گفتگو کی ہے وہ دراصل اس پہلو سے ہے کہ ہم دیگر علوم سے الگ کرکے علم کلام کو سمجھنا چاہیں تو وہ کیا قرار پاتا ہے۔ بلاشبہ علم کلام فی نفسہ ایک دفاعی علم ہے مگر اس کی یہ حیثیت صرف اس وقت تک ہے جبکہ اس کو متکلم کی ذات سے الگ کرکے خالص منطقی مفہوم میں دیکھا جا رہا ہو۔ جب کلام کے ساتھ متکلم کو ملا لیا جائے تو بات بدل جاتی ہے۔ اس وقت علم کلام صرف ایک دفاعی علم نہیں رہتا بلکہ وہ سب کچھ بن جاتا ہے جو ایک صحیح اور مطلوب اسلامی دعوت کے اندر ہونا چاہیے۔

اس کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ نماز کیا ہے۔ اگر آپ منطقی طور پر اس کا خارجی تعین کرنا چاہیں تو نماز نام ہے چند کلمات کو زبان سے دہرانے اور کچھ مقررہ حرکات انجام دینے کا۔ نماز کا خارجی تعین کسی بھی طرح اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ مگر معلوم بات ہے کہ نماز صرف اس کا نام نہیں ہے۔ نماز کا دوسرا لازمی جزو خشوع ہے۔ یہ جزو اتنا اہم ہے کہ اس کے بغیر کوئی نماز حقیقی نماز نہیں بنتی۔ (لاصلوٰۃ لمن لم یتخشع)

نماز میں یہ دوسرا جزو کہاں سے آیا۔ یہ نماز کی اس شکل میں نہیں ہے جس کو ہم خارجی طور پر جان سکتے ہیں۔ بلکہ یہ وہ جزو ہے جو انسان کی نفسیات اس کے اندر شامل کرتی ہے۔ ایک برقی انسان ایسا بنایا جا سکتا ہے جو فقہ کے سارے تعینات کے ساتھ ایک

مکمل نماز کو دہرائے۔ یہ نماز ظاہری طور پر مکمل ہونے کے باوجود خشوع سے خالی ہوگی۔ مگر نماز کی اسی شکل کو جب ایک خدا سے ڈرنے والا انسان دہراتا ہے تو اس وقت اس کی نفسیات کی آمیزش سے نماز خشوع کی نماز بن جاتی ہے۔ نماز انسان سے الگ ہو تو وہ الفاظ اور حرکات کا ایک ڈھانچہ ہے۔ نماز انسان کے ساتھ ہو تو وہ ایک پر کیف عمل ہے۔

یہی حال علم کلام ہے۔ اگر آپ کاغذ کے اوپر اس کا خارجی مطالعہ کر رہے ہوں تو علم کلام ایک دفاعی علم نظر آئے گا جو اس لیے ہے کہ مخاطب کے عقلی سوالات کا جواب دے سکے۔ لیکن جب اسی کے ساتھ آپ متکلم کو بھی ملالیں، اس متکلم کو جو حقیقی داعی ہو اور خدا کے بندوں کو خدا کی راہ کی طرف لانے کے لیے بے قرار ہو، تو علم کلام صرف اتنی سی چیز نہیں رہتا جو کاغذ کے اوپر منطقی تعیُّن میں نظر آتا ہے بلکہ اس کے اندر انسان کی ہستی کی وہ تمام چیزیں شامل ہو جاتی ہیں جو داعیانہ جذبات کے تحت پیدا ہوئی ہیں۔

اپریل ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب سے میری چند ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ ایک نہایت ذہین اور محنتی آدمی ہیں۔ انھوں نے فلسفہ میں ایم اے کیا ہے اور سات سال کی ریسرچ کے بعد برٹرینڈرسل پر اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ تیار کیا ہے۔ فلسفہ کا طالب علم یوں بھی عام طور پر مذہب کے بارے میں متشکک ہو جاتا ہے اور برٹرینڈرسل تو اس دور میں ملحدوں کا سردار ہے۔ پھر برٹرینڈرسل پر ریسرچ کرنے والے کا عالم کیا ہوگا۔ فلسفہ کی تعلیم اور برٹرینڈرسل پر ریسرچ نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو پورے معنوں میں علمی الحاد تک پہنچا دیا تھا۔

ان ملاقاتوں میں اتفاق سے چند علما بھی شامل تھے۔ میں نے گفتگو کی تو ساری گفتگو میں کہیں خدا، آخرت، رسالت وغیرہ کا کوئی نام نہ تھا۔ "منھ بند کرنے" کی ٹکنیک بھی ساری گفتگو میں کہیں استعمال نہیں کی گئی تھی۔ مگر گفتگو کے خاتمے پر انھوں نے تقریباً تمام باتوں کو مان لیا تھا۔

علما جو خاموش بیٹھے ہوئے ساری گفتگو کو حیرانی کے ساتھ سُن رہے تھے، بعد کو

انھوں نے کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کی اس گفتگو کو علم کلام کے خانے میں رکھیں یا دعوت کے خانے میں۔ اگر علم کلام کے خانے میں رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو عین دعوت ہے اور دعوت قرار دینا چاہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو پورے معنوں میں علم کلام ہے۔ میں نے کہا کہ یہ علم کلام بھی ہے اور دعوت بھی، حقیقت یہ ہے کہ علم کلام اور دعوت دونوں الگ الگ صرف اس وقت رہتے ہیں جبکہ ان کا مطالعہ منطق کی میز پر کیا جارہا ہو۔ مگر علم کلام جب ایک داعی کی ذات میں شیر وشکر ہوجائے، اس وقت ایک ایسی چیز وجود میں آتی ہے جو دعوت بھی اتنا ہی ہوتی ہے جتنا علم کلام۔

ایک وضاحت

امام ابو حنیفہ پہلے متکلم تھے پھر انھوں نے اس کو چھوڑ کر فقہ کا میدان اختیار کیا۔ ابو الحسن اشعری نے ۴۰ سال کے اعتزال کے بعد بصرہ کے منبر پر کھڑے ہو کر اس سے براءت کا اعلان کیا۔ امام غزالی کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینہ پر رکھی ہوئی تھی۔ امام جوینی کی زبان پر مرتے وقت یہ فقرہ تھا: "میں نیشاپور کی بڑھیوں کے عقیدہ پر مرتا ہوں"۔ اسی قسم کے اقوال علامہ آمدی، شہرستانی اور خسروشاہی وغیرہ متکلمین سے بھی منقول ہیں۔ امام رازی نے اپنی کتاب اقسام اللذات میں لکھا ہے کہ "میں نے دیکھ لیا کہ کلام وفلسفہ سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب"۔ امام موصوف نے مرض الموت میں ۲۱ محرم ۶۰۶ھ کو اپنا وصیت نامہ لکھوایا۔ اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

ولقد اختبرت الطرق الكلامية والمناهج الفلسفية فما رأيت فائدة تساوي الفائدة التي وجدتها في القرآن العظيم	میں نے کلام اور فلسفہ کے طریقوں کو آزمایا مگر میں نے ان کا فائدہ اس فائدہ کے برابر نہیں پایا جس کو میں نے قرآن میں پایا۔

اس قسم کے "اعترافات"، جو قدیم متکلمین کے یہاں ملتے ہیں، وہ متکلمین کی غلطی کو بتاتے ہیں نہ کہ خود علم کلام کی غلطی کو۔ علم کلام، دینی تعلیمات کو استدلال کی زبان میں پیش کرنے کا نام ہے۔ ہمارے قدیم متکلمین کے زمانہ میں جب فلسفہ ومنطق کا رواج تھا، انھوں نے اسی کو عقلی استدلال کا معیار سمجھ لیا۔ چونکہ یہ فلسفہ ومنطق خیالی موشگافیوں پر قائم تھا، اسلامی علم کلام بھی خیالی موشگافیوں کی وادی

میں بھٹک گیا اور کہا جانے لگا: من تمنطق تزندق (جو منطق میں مشغول ہوا وہ زندیق ہوگیا) حالانکہ عین اسی وقت عقلی استدلال کی ایک اور زیادہ محکم بنیاد موجود تھی۔ یہ وہ استدلال تھا جو آیات کائنات میں غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن نے اسی طرز استدلال کی تعلیم دی تھی۔ علم کلام کی بنیاد اگر آیات کائنات پر رکھی جاتی تو علم کلام لوگوں کے لئے اضافۂ ایمان کا سبب بنتا، بجائے کہ ایک متکلم کو آخر وقت میں اس سے توبہ کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

تصوف اور علم کلام کی علیحدگی کی وجہ بھی یہی ہے کہ دونوں اپنے اصل سرے کو پانے میں ناکام رہے۔ تصوف جس روحانیت کو عملیاتی ورزشوں میں ڈھونڈ رہا ہے اس کا راز خلق اللہ میں غور و فکر میں چھپا ہوا ہے۔ اسی طرح علم کلام جن دلائل کو خیالی قیاس آرائیوں میں تلاش کر رہا ہے وہ زیادہ بہتر طور پر آسمان و زمین کی نشانیوں میں موجود ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں ذکر و فکر (آل عمران) علم کلام کی بنیاد بھی ہے اور تصوف کی بنیاد بھی۔ اگرچہ دونوں اپنی اس حقیقی بنیاد سے محروم ہوکر دو الگ الگ وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔

یہ بات علم کلام کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہے کہ کسی متکلم کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے سینے پر صحیح بخاری رکھ لی۔ یہ چیز علم کلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کسی بھی شرعی کام کے سلسلے میں پیش آسکتی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ جب آدمی کا آخر وقت آئے تو وہ ہر دوسری چیز کو چھوڑ کر براہ راست خدا سے لو لگانا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جنگی حالات میں اسلامی علاقے کی سرحد پر پہرہ دے رہا ہے۔ اس اثنا میں اتفاق سے دشمن اس پر قابو پا لیتا ہے اور اس کا کام تمام کر دینا چاہتا ہے تو وہ فوراً سرحد کی رکھوالی کا کام چھوڑ کر دو رکعت نماز کی نیت باندھ لیتا ہے۔ حالانکہ اس قسم کے پہرے دار کو حدیث میں المرابط فی سبیل اللہ کہا گیا ہے اور اس کو نہایت افضل کام بتایا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ شخص چاہتا ہے کہ موت کے فرشتے آئیں تو وہ ہتھیار بند نہ ہو بلکہ سجدے میں پڑا ہو۔ بعض متکلمین کے اس قسم کے واقعات کی نوعیت بس اتنی ہی ہے۔

ایک جان دار کی آنکھ نکال کر اس کو دوبارہ الٹ کر لگا دیا جائے تو وہ جان دار اب بھی دیکھے گا۔ مگر اس کو ہر چیز الٹی دکھائی دے گی ——————

جسم کے مختلف اعضا کو صحیح کام کرنے کے لئے کتنی نازک ترکیب درکار ہوتی ہے۔ اتنا پیچیدہ نظام اس قدر صحت کے ساتھ، کیا خود بخود چل رہا ہے ——————

لندن سے ایک انسائیکلوپیڈیا چھپی ہے جس کا نام ہے "قاموس جہالت"، اس میں ساٹھ مشہور سائنسداں مختلف علمی شعبوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انسان کن چیزوں کے بارے میں ابھی تک لاعلم ہے۔ یہاں ان میں سے دس مختلف سائنس دانوں کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی شعبوں کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کے شعبہ کی واحد سب سے بڑی نامعلوم حقیقت کیا ہے۔

۱۔ کائنات اتنی یکساں کیوں

آئن رکسبرگ، پروفیسر تطبیقی ریاضیات، کوئن میری کالج، لندن: کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزار میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں، وہ تحکمی اعداد پر مشتمل ہیں جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لئے ان اعداد میں وہی متناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔

۲۔ کیا کوئی زڈ ذرہ ہے

عبد السلام، پروفیسر نظری طبیعیات، امپیریل کالج، لندن: اگلے دس برسوں میں، ہمیں یا تو زڈ ذرہ کا وجود تسلیم کرنا ہے یا یہ ثابت کرنا ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں۔ اگر اس کا وجود ثابت ہوگیا جیسا کہ موجودہ نظریہ کی پیشین گوئی ہے، تو اس کے بعد عالم فطرت کی چار طاقتیں جن کا ہمیں علم ہے، ان میں سے دو طاقتوں کا ایک ہونا ثابت ہو جائے گا۔ (یہ چار طاقتیں یہ ہیں: کشش، برقی مقناطیسیت، طاقتور نیوکلیر فورس جو کہ ایٹم کے نیوکلیس کو آپس میں باندھے رہتی ہے، اور کمزور نیوکلیر فورس جو ریڈیائی لہروں سے متعلق ہے) پروفیسر عبد السلام اور دوسرے سائنس دانوں نے حال میں کمزور نیوکلیر فورس اور برقی مقناطیسیت کو ایک ثابت کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کی ہے۔ زڈ ذرہ کی دریافت سے قوی تجرباتی تائید حاصل ہوگی۔

۳۔ ڈی این اے سے پہلے کیا تھا

ڈاکٹر گراہم کیرنس اسمتھ، لکچرر کیمسٹری، گلاسگو

RESEARCH

The top ten secrets of science

IN THE Encyclopaedia of Ignorance, published next Thursday, some 60 well-known scientists survey different fields of research, trying to point out significant gaps in our knowledge of the world. They write at very different levels, at very different lengths. However, last week we contacted some of the authors dealing with major branches of science and asked them to name a single unsolved problem which they personally found especially important or interesting. They give their choices below, together with those of two—Professor John Maynard Smith and Dr. Francis Crick—who could not be contacted and which have been taken directly from the book.*

1: Why is the universe so uniform?

Ian Roxburg, Professor of Applied Mathematics, Queen Mary College, London: "The universe is astonishingly uniform. No matter which way we look, the universe has the same constituents in the same proportions. The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers, like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. But these turn out to be the same in all places at all times. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? Or must these numbers have the particular uniform value we observe for the Universe to exist?"

2: Is there a Z-particle?

Abdus Salam, Professor of Theoretical Physics, Imperial College, London. "In the next decade we need to confirm or disprove the existence of the so-called Z-particle. If it does turn out to exist as predicted by current theory it will clinch the unification of two of the four forces we know in nature. [The four forces are gravity, electromagnetism, the strong nuclear force that binds the atomic nucleus together, and the weak nuclear force involved in radioactivity. Recently, Professor Salam and others have made some progress towards unifying the weak nuclear force and electromagnetism. The discovery of the Z-particle would lend strong experimental support.]
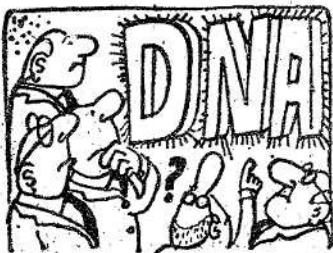
3: What preceded DNA?

Dr Graham Cairns-Smith, lecturer in chemistry, University of Glasgow. "We need to discover a new genetic material as different as you like from DNA. [The double helix structure of DNA was discovered by Francis Crick and James Watson in Cambridge in 1953.] I do not believe that DNA could have been made on the primitive earth. Life must have started with something else and DNA evolved later."

4: How are genes switched on and off?

Sir John Kendrew, Chairman of the European Molecular Biology Organisation, Heidelberg. "We know something about how genes are switched on and off in bacteria, but next to nothing about how it is done in higher animals." [It is by switching genes on and off that the cells of a single organism, which all contain the *same* set of genes, are able to do such different jobs, and become constituents of nerves, skin, etc.]

5: Why do we have an immune system?

The body's immune system defends us against infection, is responsible for allergies, and makes organ transplant so difficult. But according to *Dr. H. S. Micklem of the University of Edinburgh,* "The most interesting question is not how the immune system works, but why it is there at all. Invertebrates seem to get along quite well without one, but it is incredibly complicated in vertebrates. The idea that it was needed to detect small changes in the cell surface which might lead to cancer has been popular in the last ten years but there is a lot of data to suggest it is not good enough."

6: How can we measure evolution?

John Maynard Smith, Professor of Biology, University of Sussex, thinks that the theory of evolution has a built-in problem. "The essential components of the theory of evolution are mutation (a change in a gene), selection (differential survival or fertility of different types) and migration. The theory tells us that each of these processes, at a level far too low to be measurable in most situations, can profoundly affect evolution. Thus we have three processes which we believe to determine the course of evolution, and we have a mathematical theory which tells us that these processes can produce their effects at levels we cannot usually hope to measure directly. It is as if we had a theory of electromagnetism but no means of measuring electric current or magnetic force."
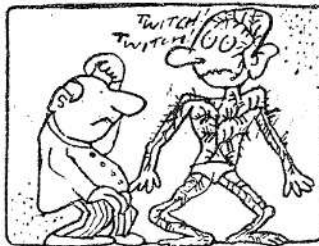
7: How is the nervous system built?

Francis Crick, Salk Institute, California. "Perhaps the most challenging problem in the whole of developmental biology is the construction of the nervous system of an animal. Many years ago it was shown by Roger Sperry that if a newt's eye was removed, so that the optic nerve from its eye to its brain was broken, then even if the eye was replaced upside down, the optic nerve would regenerate from the retina, grow towards the brain and connect up again. After a period the animal could see again with this eye but it always saw upside down. In other words, the new connection had been made 'correctly' except that the eye did not know it had been inverted. The results show that fairly precise processes are at work to make the correct, rather intricate, connections needed between one set of nerves and another but exactly what these mechanisms are we do not yet know."

[In other words, the very fact that it *was* upside down shows how specific the links are.]

8: Does the quantum theory apply to gravity?

Sir Herman Bondi, Chief Scientist, Department of Energy. "If we follow Einstein's widely accepted theory of gravity then any rapid change in the source of a gravitational field—two stars orbiting round each other, for example — should radiate gravitational waves at the speed of light. All other forms of radiation are 'quantised,' that is to say they are not continuous but come in discrete but minute packets. It is hardly conceivable that gravitational waves are not quantised too, but nobody has yet succeeded in establishing the equations, though many have tried."

9: How do different parts of the brain link up?

Professor Horace Barlow, Cambridge. "We are almost totally ignorant about how different parts of the brain communicate with one another. For example, what goes on between the parts of the brain concerned with hearing and the rest when we recognise a familiar voice? You can draw an analogy with speech. It is carried by sound waves but it is far more meaningful than the babbling of a baby which is carried by sound waves, too. In the brain nervous impulses are the equivalent of soundwaves, but we have no idea of how they become meaningful."

10: How old is man?

Dr Donald C. Johnson, Museum of Natural History, Cleveland, Ohio. "Fossil discoveries in Europe, Africa and Asia are pushing human origins further back in time. However, it is becoming increasingly clear that the scenario of human evolution is much more complex. The problem time is three to ten million years ago. There appears to have been a great diversity of possible human ancestors and we don't know how they were related."

[This is due partly to Dr Johanson's discoveries in Ethiopia and others, of even older fossils, made in Pakistan.]

"Encyclopaedia of Ignorance," published by Pergamon, £10 hardback or in two flexicover volumes, £3.50 each.

یونیورسٹی: ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک نیا جینٹک مادہ دریافت کریں جو ڈی این اے سے بالکل مختلف ہو۔ (ڈی این اے کا دہرا مرغولہ نما ڈھانچہ کیمبرج میں ۱۹۵۳ میں فرانسس کریک اور جیمس واٹسن نے دریافت کیا تھا) مجھے یقین نہیں کہ ڈی این اے ابتدائی زمین پر بن سکتا تھا ضروری ہے کہ زندگی کسی اور چیز سے شروع ہوئی ہو اور ڈی این اے کا ارتقا بعد کو ہوا ہو۔

۴۔ جین کس طرح متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں

سر جان کینڈریو، جیرمین یوروپین مالے کیولر بیالوجی آرگنائزیشن، ہائڈلبرگ: جین کس طرح بیکٹیریا میں متحرک اور غیر متحرک ہوتے ہیں، ان کی بابت ہم کسی قدر جانتے ہیں۔ مگر اعلیٰ حیوانات میں یہ واقعہ کیونکر ہوتا ہے، اس کی بابت ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ (جین کے متحرک اور غیر متحرک ہونے ہی کی وجہ سے ایسا ہے کہ ایک جسم کے سل، جو سب کے سب ایک قسم کے جین پر مشتمل ہوتے ہیں، وہ مختلف قسم کے عمل کرپاتے ہیں اور نسوں، جلد، وغیرہ کے اجزائے ترکیبی بن جاتے ہیں)

۵۔ ہمارے اندر محفوظ نظام کیوں

جسم کا مانعی نظام ہم کو چھوت سے بچاتا ہے۔ یہی ہمارے اندر الرجی کا سبب ہے، اور اعضار کی پیوندکاری کو اس قدر مشکل بنا دیتا ہے۔ مگر اڈنبرا یونیورسٹی کے ڈاکٹر میکلم کے نزدیک "سب سے زیادہ دلچسپ سوال یہ نہیں ہے کہ یہ مانعی نظام کیسے کام کرتا ہے، بلکہ یہ کہ خود اس کا وجود ہی کیوں ہے۔ بے ریڑھ کے جانور اس کے بغیر بھی اچھی طرح گزر کر لیتے ہیں۔ مگر ریڑھ دار حیوانات میں یہ نظام ناقابل یقین حد تک پیچیدگی کے ساتھ شامل ہے۔ پچھلے دس سالوں سے اس خیال کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے کہ اس نظام کی ضرورت اس لئے تھی کہ خلیہ کی سطح میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں جو سرطان کا سبب بن سکتی ہیں، ان کا پتہ لگایا جاسکے، مگر بہت سی حالیہ دریافتیں اس کی تائید کرتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔

۶۔ ارتقار کی پیمائش ہم کیسے کریں

جان مینرڈ اسمتھ، پروفیسر حیاتیات سسیکس یونیورسٹی کا خیال ہے کہ ارتقار کا نظریہ ایک ناقابل حل اندرونی مسئلہ سے دوچار ہے۔ "نظریہ ارتقار کے تین حقیقی اجزار ہیں:

تغیر (جین میں تبدیلی کا واقع ہونا)
انتخاب (فرق کا باقی رہنا یا مختلف اقسام کی زرخیزی)
نقل مکانی

یہ نظریہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک، اکثر حالات میں ناقابلِ پیمائش حد تک نچلی سطح پر، ارتقار کے عمل پر گہرے اثرات ڈال سکتا ہے۔ اس طرح ہم تین طریقوں سے واقف ہیں جن کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ وہ ارتقار کے عمل کا تعین کرتے ہیں۔ پھر ہمارے پاس ایک ریاضیاتی نظریہ ہے جو ہم کو بتاتا ہے کہ یہ تینوں طریقے ایسی سطحوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں جن کی بالواسطہ پیمائش کی ہم امید نہیں رکھتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے پاس برقی مقناطیسیت کا ایک نظریہ تو ہو مگر ہمارے پاس نہ تو برقی لہروں کو ناپنے کا کوئی ذریعہ ہو اور نہ مقناطیسی زور کو ناپنے کا۔

۷۔ نظامِ عصبی کس طرح بنتا ہے

فرانسس کریک، سالک انسٹی ٹیوٹ، کیلی فورنیا:
حیاتیاتی ترقیات میں شاید سب سے بڑا علمی چیلنج یہ سوال ہے کہ ایک جاندار میں عصبی نظام کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ بہت سال پہلے راجر اسپری نے تجربہ کر کے دکھایا تھا کہ اگر ایک دریائی چھپکلی کی آنکھ اس طرح نکالی جائے کہ اس کی نظر کی نس آنکھ سے دماغ تک ٹوٹ جائے۔ اس کے بعد اگر اس کی آنکھ کو دوبارہ الٹ کر بھی لگا دیا جائے تو نظر کی نس آنکھ کے پردہ سے دوبارہ شروع ہو کر دماغ کی طرف بڑھے گی اور دوبارہ اس سے جُڑ جائے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد جانور اِس آنکھ سے دوبارہ دیکھ سکتا تھا۔ مگر ہمیشہ الٹی شکل میں (کیونکہ آنکھ الٹی لگی ہوئی تھی) دوسرے لفظوں میں یہ کہ نیا تعلق بالکل درست تھا۔ بجز اس کے کہ آنکھ کو یہ پتہ نہ تھا کہ وہ الٹی لگی ہوئی ہے۔ یہ نتائج بتا رہے ہیں کہ اعصاب کے ایک نظام کو اعصاب کے دوسرے نظام سے ٹھیک ٹھیک مربوط کرنے کے لئے بہت ہی درست اور پیچیدہ طریقے کارفرما ہوتے ہیں۔ مگر یہ طریقِ عمل کیا ہے، اس کو ہم متعین طور پر نہیں جانتے۔ (دوسرے لفظوں میں خود یہ واقعہ کہ آنکھ الٹی لگی تھی، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ رابطے کس قدر متعین ہوتے ہیں)

۸۔ کوانٹم نظریہ کیا کشش کے نظریہ پر بھی چسپاں ہوتا ہے

سر ہرمن بونڈی، چیف سائنٹسٹ، شعبۂ انرجی:
اگر ہم آئن سٹائن کے مقبول عام نظریۂ کشش کو مانیں تو کسی مقناطیسی میدان کے مرکز میں یکایک تبدیلی (مثلاً دو ستاروں میں جو ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے ہوں) سے ایسا ہونا چاہئے کہ کشش کی لہریں روشنی کی سی رفتار سے پیدا ہوں۔ ریڈی ایشن کی دوسری تمام صورتیں "کوانٹم" کے مطابق ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلسل نہیں ہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی مقداروں کی شکل میں غیر مسلسل طور پر آتی ہیں۔ یہ بات بمشکل قابلِ فہم ہے کہ کشش کی لہریں مقداروں کی شکل میں نہیں ہوتیں۔ مگر ابھی تک کوئی اس بات کو ثابت نہیں کر سکا ہے، حالانکہ بہت سے لوگ اس کی کوشش کر چکے ہیں۔

۹۔ دماغ کے مختلف حصے کس طرح رابطہ قائم کرتے ہیں

پروفیسر ہورِس بارلو، کیمبرج: ہم تقریباً مکمل طور پر اس بات سے بے خبر ہیں کہ دماغ کے مختلف حصے کیوں کر ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُس وقت دماغ کے سننے والے حصہ میں اور بقیہ حصوں میں کس قسم کا ارتباط قائم ہوتا ہے جب کہ ہم کسی مانوس آواز کو پہچانتے ہیں۔ تم بول کو مثال میں پیش کر سکتے ہو۔ وہ صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ مگر وہ ایک بچہ کی توتلاہٹ سے کہیں زیادہ بامعنی ہوتی ہے جو خود بھی صوتی لہروں پر چلتی ہے۔ دماغ کے اندر عصبی حرکات صوتی لہروں کے مساوی ہوتی ہیں۔ مگر ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کس طرح بامعنی ہو جاتی ہیں۔

۱۰۔ انسان کب سے زمین پر ہے

ڈاکٹر ڈونالڈ جانسن، میوزیم آف نیچرل ہسٹری، کلیولینڈ، اوہائیو: یورپ، افریقہ اور ایشیا میں جو متحجرات (ف ں) برآمد ہوئے ہیں، وہ انسان کی ابتدا کو اور زیادہ پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ بہرحال یہ بات دن بدن نمایاں ہوتی جا رہی ہے کہ ارتقاء کا معاملہ (سابقہ تصور کے خلاف)

کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، وہ مدت جس کا تعین ایک مسئلہ ہے، وہ تین ملین سے لے کر دس ملین سال پیچھے تک ہے۔ انسان کے امکانی آبا و اجداد میں بظاہر بہت زیادہ فرق رہا ہے۔ اور ہم کو نہیں معلوم کہ ان کے درمیان باہمی رشتہ کیا تھا۔ (اس کی وجہ جزوی طور پر ڈاکٹر جانسن کی حبشہ میں دریافتیں ہیں۔ نیز اس سے بھی زیادہ قدیم فاسل پاکستان میں ملے ہیں)

علم کا دریا

حیرت انگیز طور پر

افرار خدا کی طرف جا رہا ہے

طبیعی تحقیقات سے مابعد الطبیعی حقائق برآمد ہو رہے ہیں

موجودہ زمانہ میں ہونے والی طبیعی تحقیقات حیرت انگیز طور پر انسان کو "مافوق الطبیعی" منزل پر پہنچا رہی ہیں۔ ہر علمی شعبہ میں یہ صورت حال پیش آ رہی ہے کہ محققین اپنی تلاش و جستجو میں جب آگے بڑھتے ہیں تو بالآخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبیعی قانون کی حد ختم ہو گئی اور مافوق الطبیعی قوتوں کی کارفرمائی شروع ہو گئی ——— ۱۹۷۸ء میں لندن سے شائع ہونے والی قاموس جہالت (THE ENCYCLOPAEDIA OF IGNORANCE) دراصل اسی صورت حال کا ایک علمی اعتراف ہے۔

کائنات کے ابتدائی منجمد مادہ میں انفجار سے موجودہ دنیا کا وجود میں آنا ۲۰ سال پہلے تک ایک سادہ طبیعی واقعہ نظر آتا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ وہ عام معنوں میں کوئی طبیعی یا مادی واقعہ نہ تھا بلکہ ایک بے حد منظم واقعہ تھا جو اخراج طاقت (ENERGY RELEASE) کے ذریعہ وجود میں آیا۔ عالم مادی کے ترکیبی اجزاء کی تصویر پہلے ایک بے ترتیب ڈھیر کی مانند تھی۔ اب محققین بتا رہے ہیں کہ کائنات ایک بے حد یکساں (UNIFORM) واقعہ ہے۔ الکٹران کے مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر زمانہ میں باقی رہتا ہے۔ گویا کسی خارجی طاقت نے تحکمی طور پر (ARBITRARILY) کائنات کو ریاضیاتی یکسانیت کا پابند کر رکھا ہے۔ زمینی حالات میں ارتقائی طور پر زندگی کے وجود میں آنے کے تمام مفروضات بے دلیل ثابت ہو رہے ہیں اور اب علمائے حیاتیات کا رجحان یہ ہوتا جا رہا ہے کہ زندگی "اوپر سے" زمین پر بھیجی گئی ہے۔ عالم فطرت کو کنٹرول کرنے والی طاقتیں "کئی" سے گھٹ کر "ایک"، ہوتی جا رہی ہے اس وحدت کے لئے کوئی مناسب سائنسی لفظ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی اس کو زڈ ذرہ (Z-PARTICLE) اور کوئی جادوئی ذرہ (CHARMED PARTICLE) کہتا ہے۔ وغیرہ

ایک سفر

۱۹ فروری کو شیوگنج (ضلع سروہی) پہنچا اور ۲۲ فروری ۱۹۷۸ کو دہلی کے لئے واپسی ہوئی ۔

شیوگنج ، دہلی سے چھ سو کلومیٹر کے فاصلہ پر راجستھان کا ایک قصبہ ہے ۔ یہ گرینڈ ٹرنک روڈ کے کنارے واقع ہے ۔ یہاں کی آبادی بارہ ہزار ہے جس میں مسلمان تقریباً ایک ہزار ہیں ۔ پہلے یہ ریاست سروہی کا ایک حصہ تھا جو سو سال سے کچھ عرصہ پہلے آباد کیا گیا ۔ آزادی ہند کے وقت سروہی ریاست کے راجہ سر سروپ رام سنگھ دیوڑا تھے جو یہاں عام طور پر " دربار صاحب ،، کہے جاتے تھے ۔ وہ اسلام سے متاثر ہوئے ۔ کئی سال تک اسلام کا مطالعہ کرتے رہے ۔ ۱۹۴۶ میں انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا ۔ اعلان اسلام کے بعد وہ زیادہ تر دہلی میں رہنے لگے تھے ۔ ان کا انتقال ۱۹۴۷ میں دہلی میں ہوا ۔ ان کی قبر اب بھی دہلی میں موجود ہے ۔ ان کا اسلامی نام سر سلطان عبد اللہ دیوڑا تھا ۔ راجہ صاحب کے اسلام کے بعد یہاں اور بھی بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے ۔

راجہ صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی ۔ انھوں نے غالباً تین بڑی بڑی جائدادیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام وقف کیں ۔ ریاستوں کے خاتمہ کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ، ان کی وجہ سے یہ جائدادیں یونیورسٹی کے قبضہ میں نہ آسکیں ۔ تاہم ، جیسا کہ مجھے بتایا گیا ، ملا طاہر سیف الدین نے اپنی چانسلری کے زمانہ میں موہن لال سکھاڈیا (سابق وزیر اعلیٰ راجستھان) پر زور ڈال کر ماؤنٹ آبو اور آبو روڈ کی دو کوٹھیوں کی جزوی قیمت یونیورسٹی کو دلائی جو تین لاکھ روپئے تھی ۔ مسٹر سکھاڈیا کا حلقہ انتخاب اودے پور تھا ۔ یہاں ملا طاہر سیف الدین کے ماننے والے کافی تعداد میں ہیں ۔ اس لئے یہاں وہ اپنی ایک انتخابی قیمت رکھتے ہیں ۔

مندرجہ بالا تین لاکھ کی رقم سے مسلم یونیورسٹی میں سروہی ٹرسٹ قائم ہوا جو ابھی تک چل رہا ہے ۔ مسلم یونیورسٹی کے پراسپکٹس (۷۶ - ۱۹۷۵) میں اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں :

SIROHI TRUST: The trust awards a limited number of stipends to deserving Muslim students, preferably from Rajasthan, who are in need of financial assistance. (p.69)

سروہی ٹرسٹ کے تحت محدود تعداد میں وظائف دیئے جاتے ہیں ۔ یہ وظائف ترجیحاً راجستھان کے مستحق مسلم طالب علموں کے لئے ہیں جو مالی امداد کے ضرورت مند ہوں ۔

یہاں چند مسجدیں ہیں ۔ میں نے ایک مسجد دیکھی جو سو سال پہلے تعمیر کی گئی تھی ۔ اس مسجد سے متصل کافی زمین ہے جن پر کچھ تعمیرات کرائی گئی ہیں ۔ تاہم اب بھی اتنی کافی زمین ہے کہ اگر اس کو استعمال کیا جائے تو یہاں ایک اچھا مدرسہ قائم کیا جا سکتا ہے جس کی یہاں سخت ضرورت ہے ۔ اس وقت بھی ابتدائی تعلیم کا ایک مکتب چل رہا ہے ۔

شیوگنج بعض تجارتی سامانوں کے لئے راجستھان کی سب سے بڑی منڈی کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ۱۷ فروری کو یہاں راشٹرپتی نیلم سنجیوا ریڈی آئے تھے انھوں نے آبادی کے باہر ایک اسپتال کا سنگ بنیاد رکھا ۔ دو سو ایکڑ زمین پر یہ جدید ترین طرز کا اسپتال جسلوک (بمبئی) کے معیار کا اسپتال ہوگا ۔ اس پر دو کروڑ روپے کے خرچ کا منصوبہ ہے ۔ یہ اسپتال حکومت ہند کے علاوہ عالمی ادارہ صحت (WHO) کے تعاون سے تعمیر کیا جا رہا ہے ۔

شیوگنج کا ریلوے اسٹیشن جوائی بندھ ہے ۔ جوائی

ایک ندی ہے اس پر ۳۰۴ مربع میل کا بندھ بنایا گیا ہے۔ تین کروڑ کی لاگت سے بننے والے اس بندھ کا افتتاح ۱۹۵۳ میں ہوا تھا۔ یہ مقام اس علاقہ کے لئے ایک عمدہ تفریح گاہ ہے۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے ۲۱ فروری کو چند گھنٹے یہاں گزارے۔ یہاں فطرت کا پرسکون ماحول ہے۔ درخت، چڑیاں، پہاڑ، جھیل، کھلا آسمان، اس قسم کی چیزوں کے درمیان جب انسان ہوتا ہے تو گویا کہ وہ اپنے خدا کے قریب ہوتا ہے۔ شہروں کی مصنوعی چمک دمک آدمی کو "مشینی تہذیب" کی یاد دلاتی ہے۔ جب کہ مناظر قدرت آدمی کو خدائی کرشموں (آلاء اللہ) کی یاد دلاتے ہیں۔ ذاتی طور پر راقم الحروف کو فطرت کی خاموش دنیا سے بے حد دلچسپی ہے۔ مگر زندگی کی ذمہ داریاں دوبارہ شہری ہنگاموں کی طرف کھینچ لاتی ہیں۔

شیو گنج کے مسلمانوں کی دعوت پر میں یہاں آیا۔

۲۰ فروری ۱۹۷۸ (۱۲ ربیع الاول) کو سیرت کے عنوان پر میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک دن میں اور دوسری رات میں۔ اجتماع میں مسلمانوں کے علاوہ کچھ غیر مسلم بھی شریک ہوئے۔ میں نے اپنی تقریروں میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ "۱۲ ربیع الاول" عام معنوں میں کوئی جشن اور عید کا دن نہیں ہے جس کے تقاضے رسمی تقریبات سے پورے ہو جاتے ہوں۔ اس کی معنویت یا دینی قدر و قیمت اسی وقت ہے جب کہ اس کو تجدید عہد کے دن کے طور پر منایا جائے۔ ایمان لاکر ہم نے اللہ اور رسول سے جو عہد کیا ہے، آج ہم اس کو پورا کرنے کا از سر نو عزم کریں۔ پھر میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کے اصحاب کے واقعات سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کا مطلب کیا ہے اور اللہ کے یہاں مومن و مسلم کی حیثیت سے اٹھائے جانے کے لئے ہمیں کیسی زندگی بنانی چاہئے۔

प्रस्तावित अस्पताल की विशेषताएँ

(१) आधुनिकतम चिकित्सा यन्त्र, सही रोग निदान एवं अनुभवी डॉक्टरों की सुविधा
(२) कुल ५०० में से लगभग २०० शय्याएँ नि:शुल्क,
(३) ट्रस्ट द्वारा संचालन। दानदाताओं को व्यवस्था में प्रतिनिधित्व, कक्ष/भवन पर नाम, एवं शय्याओं के आरक्षण की सुविधा। आयकर से मुक्ति
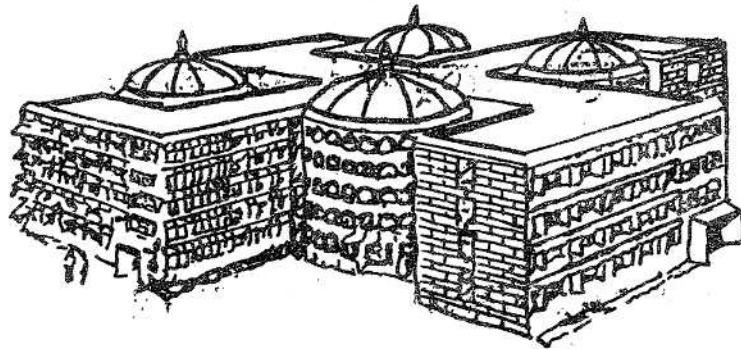
(४) कुल लागत करीब दो करोड़ रुपये (अभी तक प्राप्त आश्वासन करीब ६० लाख रुपये)
(५) मेडिकल डाइरेक्टर-डा. डी. जी. ओझा, भूतपूर्व डाइरेक्टर, मेडिकल एण्ड हेल्थ सर्विसेज, राजस्थान
चीफ इंजीनियर- श्री भीमराज शाह, भूतपूर चीफ इंजीनियर, राजस्थान
आर्कीटेक्ट- श्री उत्तम सी. जैन, बम्बई

سرسری مطالعہ سے جو رائے قائم کی جاتی ہے وہ تحقیق کے بعد اکثر غلط ثابت ہوتی ہے

معاویہ بن ابی سفیان (۶۰۵ - ۶۸۰) ایک ممتاز صحابی تھے۔ ان کے بارہ میں ایک صاحب لکھتے ہیں:
" دیت کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہ نے سنت کو بدل دیا۔ سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہو گی۔ مگر حضرت معاویہ نے اس کو نصف کر دیا، اور باقی خود لینی شروع کر دی "۔

معاہد کی دیت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف اقوال مروی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے۔ (دیۃ ذمی دیۃ مسلم، السنن الکبریٰ للبیہقی، جلد ۸، صفحہ ۱۰۲) دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی (عقل الکافر نصف دیۃ المسلم، نیل الاوطار جلد ۷، صفحہ ۶۴)
اس بنا پر عہد صحابہ سے یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہونی چاہئے، اور کچھ لوگ مسلمان اور معاہد کی دیت میں فرق نہیں کرتے۔ حضرت معاویہ نے دراصل دو رایوں میں سے ایک رائے کو ترجیح دی ہے نہ کہ خود کوئی نئی رائے پیدا کی ہے۔
"باقی خود لینی شروع کر دی"، کے الزام کی حقیقت یہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں امام زہری کا مقولہ ان لفظوں میں نقل کیا ہے: معاویہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے معاہد کی دیت کو کم کرکے نصف کر دیا اور نصف اپنے واسطے لے لی (واخذ النصف لنفسہ)
یہ عبارت سرسری نظر میں مغالطہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کی وجہ اس کا اجمال ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے معاملہ کو تفصیلی شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کا بیان اس کو واضح کر دیتا ہے کہ یہاں اپنی ذات سے مراد حکومتی خزانہ ہے۔ بیہقی نے اپنی سنن میں امام زہری کا مقولہ ابن جریج کی سند سے تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ وہاں الفاظ یہ ہیں:
فلما کان معاویۃ اعطی اہل المقتول النصف والقی النصف فی بیت المال جب معاویہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے آدھی دیت مقتول کے رشتہ داروں کو دی اور آدھی بیت المال میں داخل کر دی۔

آج لوگوں کے لئے سب سے آسان کام بولنا ہے اور سب سے مشکل کام چپ رہنا۔ مگر بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ بولنا اتنا سنگین کام معلوم ہو گا کہ لوگ سوچیں گے کاش وہ ساری عمر چپ رہتے، کاش انھوں نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہوتا ــــــ

الرسالہ ماہ فروری ۱۹۷۸ میں ایک مضمون بعنوان "شہادت حسین" شائع ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں کشمیر سے ایک دوست تحریر فرماتے ہیں:

"سیاسی حریف بننا کوئی بری بات نہیں (اگر اس کا مقصد حصول رضائے الٰہی ہو) امام حسن رضی ایک باغی کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوتے ہیں۔ اور آپ اسے صحیح قرار دے کر تعریف کرتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ باہمت باغی چھا جاتے رہیں گے۔ اور من مانے طریقوں سے اپنی مرادیں بر لاتے رہیں گے۔ کیا یہ ایک منفی رجحان نہیں ہے۔ ایک جائز طور پر بیعت شدہ خلیفہ کی دست برداری ـــــ مقابل کی طاقت سے دب کر ـــ سراسر اسلامی روح کے خلاف ہے۔"

مذکورہ مضمون کے سلسلے میں یہ بات مختلف لوگوں کی طرف سے مختلف الفاظ میں آتی رہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ امام حسن کے کردار کو نمایاں کر کے ہم لوگوں کے اندر سے جہاد کی اسپرٹ ختم کر رہے ہیں اور ان کو بزدل بنانا چاہتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ "جہاد" یا "بزدلی" ہماری خود ساختہ چیزوں کے نام ہیں یا جہاد وہ ہے جو قرآن و حدیث کے مطابق جہاد ہو۔ اور بزدلی وہ ہے جو قرآن و حدیث سے بزدلی ثابت ہو۔

مذکورہ مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ تمام تر قرآن اور حدیث اور تعامل صحابہ کی روشنی میں کہا گیا ہے۔ کوئی چیز بھی محض بیانیہ انداز سے بطور خود نہیں کہدی گئی ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہمارے کسی بھائی نے اب تک قرآن اور حدیث اور سیرت کے ان حوالوں کی بابت کچھ نہیں کہا۔ البتہ جہاد اور بزدلی کی خود ساختہ اصطلاحوں میں وہ ہمارے اوپر ریمارک دینے میں مشغول ہیں۔ اگر کسی کو اختلاف ہو تو اس کو یہ ثابت کرنا چاہئے کہ مذکورہ مضمون میں جو حوالے دیئے گئے ہیں۔ وہ غلط ہیں۔ یا ان سے وہ بات نہیں نکلتی جو مضمون نگار نے ان سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور یہ ساری بحث علمی انداز میں ہونی چاہئے نہ کہ محض لفظی ریمارک کی صورت میں۔

حق وہ نہیں ہے جو ہمارے اپنے ذہنی سانچہ میں حق نظر آئے۔ حق وہ ہے جو قرآن و حدیث سے حق ثابت ہو۔

انسان سے کم ، اللہ سے زیادہ

قال ثور بن یزید ۔ قرأتُ فی بعض الکتب ان عیسیٰ علیہ السلام قال : یا معشر الحواریین کلموا اللہ عزوجل کثیرا و کلموا الناس قلیلا۔ قالوا : کیف نکلم اللہ کثیرا۔ قال : اخلوا بمناجاتہ، اخلوا بدعائہ (خرجہ ابو نعیم)

ثور بن یزید کہتے ہیں۔ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین سے کہا۔ اے لوگو! اللہ سے زیادہ باتیں کرو اور انسانوں سے کم باتیں کرو۔ انھوں نے پوچھا۔ کس طرح ہم اللہ سے زیادہ باتیں کریں۔ حضرت عیسیٰ نے کہا: ـــــ تنہائیوں میں اللہ سے سرگوشیاں کرو، تنہائیوں میں اللہ سے دعا مانگو۔

"الاسلام" کے بعد ادارۂ الرسالہ کی دوسری کتابی پیش کش

ظہور اسلام

از مولانا وحید الدین خاں

صفحات ۲۰۰ —— قیمت دس روپے

آفسیٹ کی اعلیٰ طباعت کے ساتھ

جدید اسلامی لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب

روانگی کا خرچ بذمہ ادارہ

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

قرآن پہلی کتاب ہے جس نے انسانی تاریخ میں دور نثر کا آغاز کیا۔ علمی طرز فکر کی بنیاد رکھی اور سائنٹفک استدلال کو رائج کیا۔ موجودہ دور کا علمی انقلاب، قرآن ہی کے پیدا کردہ انقلاب کا نتیجہ ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ قرآن کے حاملین اس انقلاب کو سمجھنے میں سب سے پیچھے ہیں —— وہ ابھی تک شعر و شاعری کی فضا سے نکل نہ سکے۔ حتیٰ کہ ان کی نثر بھی خطابت اور شاعری کی ایک صورت ہوتی ہے۔ سائنٹفک استدلال میں ان کے پیچھے ہونے کا حال یہ ہے کہ ان کے علماء اب بھی سائنٹفک استدلال اور مغرب زدگی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کی اس علمی پس ماندگی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دور جدید کے معیار فکر پر ابھی تک اسلام کا علمی اظہار نہ ہو سکا۔ ہر دور کا ایک اسلوب اور ایک علمی معیار ہوتا ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنے دور کے فکری معیار پر خدا کے دین کا اعلان کریں۔ "ظہور اسلام" جدید اسلامی تاریخ کی پہلی کتاب ہے جس میں اسلام کو وقت کے معیار فکر پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔